بچوں کے لیے دلچسپ، انوکھی، سبق آموز اور منفرد کہانیاں
5 New Stories
خوبصورت کہانیاں
STORY NO 6
ماسٹر پبلشرز
المعراج سنٹر
22-اُردو بازار لاہور

ہر دل عزیز جنگجو

یہ اس زمانے کی بات ہے جب برصغیر پاک و ہند پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ ہر ریاست اور ہر صوبے پر انگریزوں کا قبضہ ہوتا جارہا تھا تب ایک نوجوان آندھی کی طرح آتا اور طوفان بن کر چلا جاتا تھا۔ اس کا اصلی نام کسی کو بھی نہیں پتا تھا۔ لیکن اسے پورے دستے کے ساتھ اکیلا لڑتا اور پورے دستے کو موت کے گھاٹ اتارتے دیکھ کر عینی شاہدین نے اسے جنگجو کا نام دے رکھا تھا۔ اب سب اسے جنگجو کے نام سے پکارتے تھے۔ جنگجو نہ صرف قوم سے جنگ کرتا تھا بلکہ ان مسلمانوں اور ہندوؤں اور سکھوں کو بھی مارتا تھا۔ جنہوں نے غدار بن کر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اور دولت و شہرت اور اقتدار کے لالچ میں ان سے ملے ہوئے تھے۔ یہ ایک بدترین تاریخ بن گئی تھی کہ ایک دن ایک مغل بادشاہ کے پاس ایک انگریز آیا اور اس نے ہندوستان میں تجارت کی اجازت مانگی۔ اس وقت کا بادشاہ انگریزوں سے شاید واقف نہیں تھا یا پھر وہ دور اندیش نہیں تھا۔ اس نے انگریزوں کو تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ انگریزوں کا پہلا قدم تھا جو وہ ہندوستان میں تجارت کے نام پر رکھ چکے تھے۔ پہلی مرتبہ میں دس انگریز ہندوستان میں تھوڑا سا تجارتی مال لے کر داخل ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ ان کے وفود آنے لگے دیکھتے ہی دیکھتے انگریزوں کی اچھی خاصی تعداد ہندوستان میں در آئی اور وہ ہندوستان پر حکومت کرنے کا منصوبہ اور خواب ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان کے ساتھ تجارتی مال میں نہ صرف تجارتی مال ہوتا تھا بلکہ جدید ترین اسلحہ بھی ساتھ ہوتا تھا یوں رفتہ رفتہ نہ صرف انگریزوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا بلکہ ان کے اسلحے کے گوداموں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ہندوستان کو لوگ سونے کی چڑیا کہتے تھے کیونکہ یہاں پر معدنیات اور زروجواہرات، سونا چاندی، ہیرے موتیا اور بے شمار دولت تھیں لہٰذا اس سونے کی چڑیا کو لوٹنے کا مکمل پروگرام بنا کر انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور اب ان کی پوزیشن اس قدر مضبوط ہو گئی تھی کہ وہ اسلحہ بند ہو کر اپنے خواب کی تعبیر پا سکتے تھے اور یہی ہوا تھا۔ ایک دن اکا ایک دن ایک ریاست پر انہوں قبضہ جما لیا۔ ریاست کے راجہ کو مار کر پوری ریاست پر اپنا عمل دخل کر لیا۔ اس کی حدود پر اپنے فوجی تعینات کر دیئے اور خود مسند حکومت پر براجمان ہو گئے۔ یہیں سے ہندوستان پر ان کی حکومت کا آغاز ہوا۔ انگریز سب سے زیادہ چالاک، عیاش، مکار اور غدار قوم ہے۔ لہٰذا انہوں نے ان تمام خوبیوں اور صفات کو بروئے کار لاتے ہوئے حکومت کی بنیاد ڈالی اور کامیاب رہے۔ جتنا عرصہ انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند میں تجارت کی غرض سے قیام کیا اتنے عرصے انہوں نے ہندوستان کے باسیوں، راجاؤں اور بادشاہوں کے چال چلن، عادات و اطوار، تہذیب و تمدن، طور طریقے، رہن سہن، کھانا پینا اور اخلاق و سیرت و کردار دیکھ لئے تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ یہ لوگ لالچی [illegible] اقتدار کے [illegible] عیاش طبع ہیں۔ لالچی اس طرح ہیں کہ ذرا سا روپوں کا لالچ [illegible] ایک [illegible] کے آدمیوں کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے اور وہ با آسانی غداری [illegible] لہٰذا انگریزوں کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے [illegible] بادشاہ [illegible] راجہ [illegible] سکا تو ان کے [illegible] اور وزیروں [illegible] دایا اور شکست دے کر حکومت حاصل کی۔ اقتدار کے بھوکے [illegible] ایک بیٹا اقتدار حاصل کرنے کے لئے اپنے بادشاہ باپ کو مار دیتا تھا۔ ایک بھتیجا اقتدار کی خاطر اپنے چچا کو مار کر مسند حکومت کو سنبھال لیتا تھا۔ لہٰذا اس بدترین مثال نے انگریزوں کے حوصلے بڑھا دیئے تھے اور انہوں نے بھی بیٹے کے ہاتھوں باپ کو، بھائی کے ہاتھوں بھائی کو اور بھتیجے کے ہاتھوں چچا کو

قتل کرا کے حکومت حاصل کر لی۔ قاتل کو یا غدار کو پہلے تو انگریزوں نے لالچ دیا کہ وہ ساری ریاست اس کے حوالے کر دیں گے۔ لیکن جب قاتل بیٹے نے باپ کو مقتول کر دیا تو بیٹے کو ریاست کی حکومت دینے کی بجائے غداری کا انعام موت کی شکل میں دیا۔ ان معاملات میں میر صادق اور میر جعفر کی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے کہ کام لینے کے بعد انگریزوں نے کسی کو گولوں کی جگہ توپ کے دہانے بھر کر پاش پاش کر دیا اور کسی کے منہ میں سونا چاندی پگھلا کر ڈال دیا اور کسی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندان میں بند کر دیا۔ انگریزوں نے ہندوستان کی عوام اور خواص کی عیاش طبعائی کا اندازہ اس طرح لگایا تھا کہ انہوں نے ملاحظہ کیا کہ ایک ایک بادشاہ نے چار چار شادیاں کی ہوئی ہیں اور اس کے علاوہ دس دس یا اس سے زیادہ کنیزیں بھی رکھی ہوئی ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ عورت کے پیچھے سلطنتیں تباہ ہوئی ہیں اور بادشاہتیں ختم ہو گئی ہیں۔ لہٰذا انگریزوں نے بھی اپنی عورتوں سے کام لیا اور انگریز عورتیں بھی اپنے مردوں کے شانہ بشانہ اس مہم میں کام کرنے لگیں اور اپنے مردوں کے نقش قدم پر چلنے لگیں۔ انہوں نے برابر کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کی مغلیہ حکومت کا تختہ پلٹنے میں اس طرح انگریزوں نے ہر ریاست اور صوبے پر قبضہ جما لیا۔ راجاؤں کو قتل کیا۔ بادشاہوں کو نظر بند کر دیا اور غداروں سے کام لے کر انہیں عبرت ناک سزائیں دیں۔ لیکن اس کے باوجود ہند کے انسان نہ سمجھے اور نہ سنبھلے۔

لہٰذا انگریزوں کے خلاف کئی بہادر مسلمان بادشاہ نبرد آزما بھی ہوئے اور انہوں نے مرتے دم تک ان کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ ان سے نجات پانے اور ہندوستان کو ان کی غلامی سے آزاد کرانے کی بھرپور کوششیں کیں اور اسی کام کو کرتے ہوئے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ جس میں ٹیپو سلطان اور حیدر علی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے مرتے دم تک انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی اور آزادی کی کوشش کی لیکن ہائے نصیب دشمنان اپنوں کی غداری، دولت کے لالچ، اقتدار کی بھوک اور عیاشی کی

وجہ سے نقصانات اٹھانے پڑے۔ یہاں تک کہ حق کے لئے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ان غداروں کو بھی کچھ نہ مل سکا۔ انگریزوں نے انہیں اور آئندہ لوگوں کو نصیحت کرنے کے لئے ایک جملہ ضرور کہا۔ ''جو شخص اپنی قوم سے وفا نہ کر سکا وہ بھلا غیر قوم سے وفا کیسے کرے گا''۔ اس قدر بے غیرتی پر بھی ہندوستان والوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور وہ غفلت کی نیند سے بیدار نہ ہو سکے۔

جنگجو بھی اس زمانے میں زمین سے نکل آیا آسمان سے نازل ہوا۔ یہ کو پتا نہیں تھا لیکن اس نے ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ جنگجو کو عوام پسند کرنے لگی تھی۔ وہ ہر دل عزیز ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ ایک تو وہ انگریزوں کو پہلے قتل کرتا تھا جنہوں نے زیادتی میں حد سے تجاوز کیا ہوا تھا۔ وہ ہندوستان کی رعایا کو اپنا غلام سمجھتے تھے۔ بیس بیس گھنٹے تشدد کر کے مشقت کا کام لیتے تھے۔ انہیں پیٹ بھر کے کھانا پینا بھی نہیں دیتے تھے اور آرام کی مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ وہ جس کو مرضی آئے قید کر کے جیل بے جا میں رکھتے تھے۔ ہر حسین اور جوان لڑکی کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔ یوں انگریزوں کے ہاتھوں کسی بھی شخص کی عزت و آبرو، مال و دولت اور کاروبار محفوظ نہیں تھا۔ انگریزوں کی من مانیاں بڑھتی بڑھتی حد سے تجاوز کر گئی تھیں۔ لہٰذا جنگجو نے پہلے ایسے انگریزوں کو نشانہ بنانا شروع کیا جو ظالم کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ انگریزوں کے پاس ہر قسم کا جدید اسلحہ موجود تھا۔ وہ ہندوستان میں بندوق اور گولیاں لے کر آئے۔ توپ انگریزوں نے متعارف کرائی، لیکن جنگجو کے پاس فقط تلوار اور ڈھال کے علاوہ کچھ نہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھالے کا استعمال بھی کرتا تھا۔

ہفتے کا دن تھا۔ ایک وائسرائے اپنی فوج کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ وائسرائے بگھی میں سوار تھا اور اس کے ارد گرد گھوڑوں پر محافظ سوار چل رہے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کو گورا کہا جاتا تھا۔ ''گورے آ رہے ہیں''۔ یہ آواز لگا کر عورتیں اپنے گھروں کے

دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیں لیکن اتفاق سے ایک تین سالہ بچہ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگا اور وہ دوڑ کر بگھی کے سامنے آ گیا۔ وائسرائے کو بچے کا بھی خیال نہ آیا اور اس سنگ دل ظالم انسان نے بچے کو بگھی کے نیچے روند ڈالا۔ ننھی سی جان اسی وقت نکل گئی اور اس کا مردہ جسم سڑک پر پڑا رہ گیا۔ وائسرائے کے گزر جانے کے بعد اک شور مچا تو لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ ماں نے بچے کی لاش خون میں تر بتر دیکھی تو زار و قطار رونے لگی اور بد دعائیں دینے لگی۔ شاید یہ بچہ کسی ہندو گھرانے کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔ اس گھرانے میں صف ماتم بچھ گئی اور ان کے گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ انگریزوں کو جی بھر کر بد دعائیں دے رہے تھے اور کوس رہے تھے۔ لیکن مجبور و بے بس تھے کیونکہ ہندوستان کا سارا نظام انگریزوں کے ہاتھ میں تھا، قانون ان کا تھا اور قانون دان بھی انہی کے تھے۔ کس سے فریاد کی جاتی۔ کس سے انصاف مانگا جاتا، کون ان کی فریاد سنتا اور کون انہیں انصاف دیتا۔ لہٰذا ایسی بے بسی اور بے کسی میں ہندو مندر میں جا کر اپنے بھگوان سے پرارتھنا کرتے اور مسلمان مسجدوں میں خدا سے التجائیں کرتے۔ سکھ گوردوارے میں سر جھکائے آہ و فغاں کرتے رہتے اور عبادت گاہوں سے باہر آ کر وہ کسی شخص کو پکارتے جو انہیں ان ظالموں کے ظلم سے بچائے۔ ایسے میں جنگجو آندھی کی طرح نازل ہوتا اور طوفان کی طرح سب کچھ تباہ و برباد کر کے چلا جاتا۔

نہ جانے جنگجو کو کون خبر دیتا تھا یا اس کے جاسوس پھرتے تھے۔ جب اسے یہ خبر دی گئی کہ وائسرائے ہند نے ایک تین سالہ بچے کو صرف اس لئے بگھی کے نیچے کچل کر مار دیا کہ وہ اس کی بگھی کے سامنے آ گیا تھا۔ نہ جانے کب اور کہاں سے وہ وا[illegible]ائے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے زرہ بکتر زیب تن کی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دھاری تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں بڑی سی ڈھال۔ جنگجو دیکھنے میں بھی انتہائی طاقت ور، بہادر اور حوصلہ مند نوجوان لگتا تھا۔ اس کی تلوار میں غضب کی کاٹ تھی۔ وہ ایک ہی [illegible] تلوار بھی

چلاتا تھا اور ڈھال بھی سنبھالتا تھا اور گھوڑے کو اپنی مرضی سے پینتروں کے مطابق بدلتا بھی تھا۔ یہ کمالات کسی عام آدمی میں نہیں ہوتے۔ جنگجو کو دیکھتے ہی ایک شور اٹھا ہر طرف سے جنگجو۔۔۔۔جنگجو کے نعرے بلند ہونے لگے۔ جنگجو کا چہرہ ہمیشہ چھپا ہوا ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر لوہے کا خول چڑھا ہوا تھا۔ اگر خول نہ ہوتا تو یقیناً وائسرائے ہند اس کے چہرے پر غیض و غضب اور نفرت و غصے کے آثار ضرور دیکھ لیتا۔ وائسرائے نے جیسے ہی جنگجو۔۔۔۔جنگجو کے نعروں کی آوازیں سنیں تو اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا کیونکہ وائسرائے ہند نے آج سے پہلے بھی جنگجو کا نام سن چکا تھا۔ اس کے کارناموں کی تفصیلات پڑھی تھیں جو اس کی آمد پر ہندوستان میں مقیم گورنروں نے بتا کر دی تھیں۔ وائسرائے ہند جنگجو کے نام اور کارناموں سے واقف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جنگجو مظلوم انسانوں کا ساتھی ہے۔ غریبوں کا سہارا ہے۔ بے کسوں کا مددگار ہے اور ظالموں کا دشمن ہے۔ ہتھیاروں کا ہتھیارا ہے۔ قاتلوں کا قاتل ہے۔ دشمنوں کا دشمن اور دوستوں کا دوست ہے۔ وائسرائے نے قریب گھوڑے پر سوار محافظ سے کہا کہ موقع اچھا ہے، آج جنگجو کو زندہ واپس جانے نہیں دیا جائے۔ لہٰذا یہ حکم سنتے ہی محافظوں نے خوف زدہ ہوتے ہوئے بھی جنگجو پر حملہ کر دیا۔ عینی شاہدین نے دیکھا کہ جنگجو نے ایڑ لگا کر گھوڑے کو ہوشیار کیا اور برق رفتاری سے چلا اور چشم زدن میں چھ گھڑ سواروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی تلوار لہرائی اور دشمنوں کے متکبر سروں کو زمین بوس کر دیا۔ جنگجو کی تلوار میں اس بلا کی کاٹ تھی کہ ایک گھڑ سوار محافظ کا تو بدن ایک وار سے دو ٹکڑے ہو گیا تھا اور اس کے وار میں اس قدر زور تھا کہ ایک گھڑ سوار محافظ کا سر تن سے الگ ہو کر ایک عورت کے قدموں میں جا گرا تھا۔ جسے اس عورت نے نفرت سے ٹھوکر مار دی تھی۔ جنگجو کا یہ حملہ اس قدر سخت تھا کہ انگریز سنبھل نہ پائے اور اس پر گولیوں کی برسات وائسرائے ہند نے کر دی۔ جنگجو کا گھوڑا بھی جنگجو کی طرح چست و

چالاک اور جنگی حربوں سے آگاہ تھا اور جنگجو کا دست راست بنا ہوا تھا۔ وہ گھڑ سواروں کو تو گھوڑے نے اپنے پیروں کے نیچے کچل کر ہلاک کیا تھا۔ گھوڑا پہلے حملے کے بعد دوبارہ سرعت سے مڑا اور دشمنوں پر پل پڑا۔ اس بار جنگجو نے نہ صرف تین گھڑ سوار محافظوں کو مارا بلکہ ایک محافظ سے بندوق بھی چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ وائسرائے موت سامنے دیکھتے ہوئے ڈر سے برا حال تھا۔ اس نے راہ فرار اختیار کرنے میں ہی غنیمت جانی۔ لہٰذا ہو کو چوان کو حکم دینے لگا کہ بھاگ چلو۔ کوچوان نے بگھی کو سرپٹ دوڑایا اور دور نکل گیا۔ وائسرائے کو بھاگتا دیکھا تو اور بھی بہت سے محافظ بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ جنگجو نے ان کا پیچھا کیا اور دو محافظوں کو پکڑ لیا۔ فوری طور پر ان کا سر قلم کر دیا۔ وائسرائے کی قسمت اچھی تھی کہ وہ جان بچا کر نکل گیا لیکن جنگجو کو اس کی تلاش تھی۔

یہ لوگوں نے اکثر دیکھا تھا کہ جنگجو واردات کے بعد فوراً کہیں دور جا کر غائب ہو جاتا تھا۔ لوگوں کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے نجات دہندہ سے ملیں۔ اس کی شکل دیکھیں۔ اس سے باتیں کریں۔ اس کا شکریہ ادا کریں۔ اس کو دعاؤں سے نوازیں۔ اس کے گلے میں انعامات کے ہار پہنائیں لیکن آج تک عوام کی خواہش پوری نہ ہو سکی تھی۔ کیونکہ واردات کے بعد جنگجو کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا ہوا نظروں سے غائب ہو جاتا اور پھر جنگجو کو پتا نہ رہتا۔ لیکن عوام کے لئے جنگجو کا نام خوشی کی علامت تھا جبکہ انگریزوں کے لئے پریشانی اور موت کا نشان تھا۔

وائسرائے ہند جیسے تیسے محل میں پہنچا اور سانس ٹھکانے پر لانے کے بعد اس نے تمام گورنروں کو اکٹھا کیا۔ دوسرے دن تمام گورنر جمع ہو گئے تو اس نے جنگجو کا مسئلہ سامنے رکھ دیا۔ وہ کہنے لگا۔ آل گورنرز، غور سے سنو! ہماری حکومت نے بڑے بڑے بہادر سپہ سالار اور سالار اعظموں کو شکست دی ہے۔ راجاؤں اور مہاراجاؤں کو زیر کیا ہے۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان جیسے مسلم مجاہدوں کو قابو کیا ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہم نے ان میں

سے اکثر کو غداروں کے ذریعے مروایا ہے۔ کسی کو دھوکے سے قتل کرایا ہے۔ کسی کو وعدہ خلافی کر کے مارا ہے۔ کسی کو خرید کر اپنی راہ سے ہٹایا ہے اور کسی کا ایمان خرید کر اسے بے ایمان کیا ہے۔ کسی کی بیٹی کو اغوا کر کے ہم نے اپنی بات منوائی ہے۔ کسی کو حبس بے جا میں قید رکھ کر اور کسی پر بے حد بے حساب ظلم وستم کر کے۔ لیکن یہ جنگجو کا بچہ کون ہے جسے اب تک تم نہ زیر کر سکے ہو اور نہ مار سکے ہو اور نہ مروا سکے ہو؟ کیا ہمارے پاس وہ دولت ختم ہو گئی ہے یا عیاشی کے سامان نہیں رہے۔ کیا ہماری طاقت کمزور پڑ گئی ہے یا ہماری قوت کم ہوگئی ہے یا ہمارے پاس وہ ذہن نہیں رہا جو جنگجو کو مارنے کا طریقہ سوچ سکے؟ وائسرائے کی غیض وغضب سے بھری تقریر اور طنز وطعنے سن کر سب گورنر سر جھکائے کھڑے رہے۔

کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو پھر ایک بار وائسرائے ہند کی آواز ابھری۔ ''میں کچھ نہیں جانتا، مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر جنگجو چاہیے۔ زندہ یا مردہ!'' وائسرائے ناممکن بات کو ممکن بنانے کا حکم دے کر خاموش ہوگیا۔ ''سر! آپ کی ہر بات درست ہے۔ لیکن ہم اس وقت پکڑنے میں کامیاب ہوں کہ جب وہ ہمیں دکھائی دے گا۔ وہ تو آندھی کی طرح آتا ہے طوفان کی طرح چلا جاتا ہے۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ اس پر گولیاں بھی اثر نہیں کرتیں اور تلوار سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہے''۔ ایک گورنر نے ڈرتے ڈرتے زبان کھولی۔ ''کیوں ممکن نہیں ہے؟ سنو! میں تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں، تم اس پر عمل کرو، وہ بہت جلد مارا جائے گا۔ پانی پت کے میدان میں دس مسلمان، دس ہندو آدمیوں کو لے کر جاؤ اور ان پر ظلم کرو، کوڑے برساؤ اور انہیں مختلف قسم سے ظلم کرو۔ جنگجو مظلوموں کا ساتھی ہے وہ ضرور ان کی مدد کے لئے آئے گا۔ تم پہلے سے اس میدان کے چاروں طرف توپیں نصب کر کے رکھو۔ محافظوں کو تعینات کرو اور اس جگہ کو ٹارگٹ بناؤ۔ گھڑ سوار تیار کھڑے رکھو۔ پیدل فوج کے دستے اسلحے سے لیس موجود رکھو اور بارود پورے میدان میں بچھا دو تاکہ میدان میں آنے کے بعد اس کے زندہ بچ جانے کی کوئی امید نہ رہے۔ ہماری آج

روانگی ہے، ہم لندن واپس جا رہا ہے لیکن جنگجو کی موت کی خبر سننے کے لئے ایک ہفتے بعد واپس آئے گا، اگر تم جنگجو کو مارنے یا پکڑنے میں ناکام رہا تو ہم تم سب کو ڈس مس کر دے گا۔ اوکے''۔ وائسرائے ہند یہ خبر سنا کر اور حکم دے کر روانہ ہوگیا۔ لیکن ہر گورنر حیرانی کا مجسمہ بنا کھڑا تھا اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگا۔ لیکن ترکیب انہیں پسند آئی تھی۔

چار دن کے اندر جنگجو کو مارنے کا منصوبہ پورا ہوا۔ پانی پت کے میدان میں بارود بچھا دی گئی۔ یہ بارود ایسی تھی کہ دور سے اسے آگ دکھائی جاتی تو یہ میدان کے درمیان میں آنے والی ہر چیز کو اڑا کر رکھ دیتی۔ میدان کے چاروں طرف تین توپوں کو نصب کر کے ان کے دہانوں میں گولے بھر بھر کر تیار کھڑا کر دیا گیا، گھڑ سوار محافظوں کو بندوقیں دے کر ہوشیار کیا گیا۔ ان کے علاوہ پیدل فوج کے دستے۔ تیر انداز اور تلوار باز بھی موجود تھے۔ پلان کے مطابق دس ہندو قیدیوں کو میدان میں لایا گیا اور دس بغاوت کرنے والے مسلمان ملزموں کو میدان میں لایا گیا اور اعلان کرا دیا گیا کہ آج باغیوں کو سر عام سزائیں دی جائیں گی۔ تاکہ عبرت ہو اور کوئی شخص انگریزوں اور انگریزی سرکار کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند نہ کرے اور باغی ہونے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ اعلان ہونے کے بعد عوام کا ہجوم لگنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سے ہزاروں لوگ جمع ہوگئے۔ لوگوں کو دکھانے کے لئے انگریز جلادوں نے ہندو قیدیوں اور مسلمان باغیوں پر ظلم وستم کرنا شروع کر دیا۔ کبھی وہ ان کو کوڑے سے مارتے اور کبھی تکلیفیں دیتے۔ کبھی ان کے ہاتھوں کے ناخن نوچتے اور کبھی ان کے بالوں کو نوچ نوچ کر سر سے اکھاڑ دیتے۔ کئی گھنٹے یہ ظلم وستم چلتا رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ جنگجو کو اس ظلم کے بارے میں پتا چلا تو وہ دوڑا چلا آئے گا۔ ان مظلوموں کو بچانے کے لئے اور ہمارے پھیلائے ہوئے بارود اور توپوں کے جال میں پھنس جائے تاکہ جنگجو کو مار کر وائسرائے کو خوش کیا جا سکے اور اپنے اپنے عہدے بچائے جا سکیں۔ ابھی انگریزوں کا ظلم جاری تھا کہ ایک شور اٹھا۔ جنگجو۔۔۔۔

جنگجو۔۔۔جنگجو۔۔۔۔عوام نے پلٹ کر دیکھا تو دور سے جنگجو گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا۔ انگریزوں نے توپچیوں کو الرٹ کر دیا۔ تیر اندازوں نے کمانوں میں تیر کھینچ لئے۔ بندوق بردار فوج نے ٹرائیگروں پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ بارود کے نیچے چھپی ہوئی تیل میں بھیگی رسی کو جلانے کے لئے مشعل بردار چوکنا ہو گیا۔ آن واحد میں جنگجو انسانوں کا ہجوم چیرتا ہوا میدان کے اندر آ گیا۔ اس نے قیدیوں کے پاس پہنچ کر ظالموں کو تلوار کی زد پر رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ جلادوں کو موت کے گھاٹ اتار کر قیدیوں کی رسیاں تلوار سے کاٹ ڈالیں اور انہیں فرار ہونے کا حکم دیا۔ قیدی فرار ہو کر عوام میں مل گئے تھے۔ انگریزوں کے خیال کے مطابق جنگجو ان کے جال میں پھنس چکا تھا۔ فوج کے کمانڈر نے مشعل بردار شخص کو حکم دیا کہ وہ بارود کو آگ لگا دے۔ مشعل بردار نے جیسے ہی تیل میں بھیگی رسی کو آگ لگائی وہ جلتی ہوئی بارود تک پہنچی تو آدھے میدان میں آگ لگ چکی تھی۔ گورے جلادوں کی لاشوں کے ساتھ ساتھ جنگجو کی لاش اور گھوڑے کا جسم بھی جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ انگریز بہت خوش ہوئے کہ چلو اب وہ جنگجو سے نجات پا چکے ہیں۔ صرف انہیں بارود ہی ضائع کرنا پڑا۔ نہ توپیں چلیں، نہ گولیاں اور پانچ فوجیوں کے جانی اور کچھ مالی نقصان کے سوا کچھ نہ ہوا۔ عوام سہم گئی کہ جنگجو مر چکا ہے۔ اب انگریز ان پر پہلے سے بھی زیادہ ظلم کے پہاڑ توڑیں گے، یہ سوچ کر سب لوگ گھروں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ رفتہ رفتہ تمام انگریزوں نے جنگجو کی جلی ہوئی لاش کے پاس جمع ہونا شروع کر دیا۔ اسلحہ بردار، توپچی، بندوق والے، تیر انداز اور تلوار باز سبھی انگریزوں نے اپنی اپنی جگہ چھوڑ دی اور بیچ میدان میں آ گئے۔ جہاں جنگجو اور اس کے گھوڑے کی جلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ انگریزوں نے جنگجو کی موت کا یقین کر لینے کے بعد "ہررے" کا نعرہ لگا کر خوشی کا اظہار کیا کہ اب ان کے کارنامے سے ان کا باس وائسرائے ہند خوش ہو جائے گا اور ان کو انعامات سے نوازے گا۔ نہ صرف ان کی نوکریاں بچ جائیں گی بلکہ ان کو نئے عہدوں پر ترقیاں بھی ملیں

گی۔ ابھی وہ پلٹنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک توپ سے گولہ نکلا اور میدان میں جمع ہوئے فوجیوں پر آ گرا۔ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ توپ سے گولہ کس نے چلایا ہے۔ انگریزوں نے گھبرا کر دیکھا تو جنگجو کھڑا تھا جو اب دوسری توپ سے گولہ پھینک رہا تھا۔ پھر تیسری توپ سے گولہ نکلا اور پھر چوتھی توپ سے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گولوں کی برسات ہو گئی۔ مرنے سے پہلے انگریزوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ انہوں نے بارود سے جلا کر جس شخص کو مارا ہے۔ وہ اصل میں جنگجو نہیں تھا بلکہ اصلی جنگجو تو وہ تھا جس نے ان کو انہی کی طرح دھوکہ دے کر توپ سے گولے چلا کر مار دیا تھا۔ پانی پت کا میدان لاشوں سے اٹ چکا تھا۔ تمام انگریزوں کو موت کی نیند سلانے کے بعد جنگجو نے ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر لوگوں کو اشارہ کیا کہ وہ آئیں اور دیکھیں ظالموں کا حال کیا ہوا ہے۔ ظلم حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ آج بھی یہی ہوا ظلم حد سے بڑھا اور مٹ گیا۔

لوگ جوق در جوق جنگجو کو زندہ دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ وہ سب حیران تھے کہ جنگجو کے کسی وفادار ساتھی نے اس کے جیسا روپ بدل کر خود کو ایثار کر دیا اور بیس قیدیوں کے ساتھ جنگجو کی جان بھی بچا لی اور تاریخ رقم بھی کر دی کہ اس کی ایک قربانی سے ان کے نجات دہندہ کی اور بیس آدمیوں کی جانیں بچ گئیں بلکہ ان پر ظلم ڈھانے والوں کا قلع قمع بھی ہو گیا۔ حسب معمول جنگجو مشرق کی طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انگریزوں کی کثیر تعداد میں اموات ہوئی تھیں۔ اس خبر نے پورے ہندوستان میں آگ لگا دی۔ نفرت کی آگ، دشمنی کی آگ، حسد کی آگ اور یہ آگ انگریزوں کے دل میں جنگجو کی وجہ سے لگی تھی۔ وائسرائے ہند کو پتا چلا کہ جنگجو کو پکڑنے کے لئے "زندہ یا مردہ" کی ترکیب پر عمل کیا گیا تھا جس کی بھینٹ بے شمار انگریزوں کو چڑھنا پڑا لیکن اس کے باوجود جنگجو ہاتھ نہ آیا۔ وائسرائے ہند بہت شاطر اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے اس بار جنگ میدان میں ہتھیاروں سے لڑ کر جیتنا نہیں چاہا بلکہ جنگ کو دوسری سمت لے گیا۔ وائسرائے

ہند نے ہندوستان میں چارج سنبھالتے ہی سب سے پہلے خفیہ طور پر بڑے بڑے مسلمان عاملوں، فقیروں، درویشوں اور جھاڑ پھونک کرنے والوں کو طلب کیا اور انہیں بھاری رقومات بطور انعام واکرام دینے کا وعدہ کیا۔ پھر ان سے درخواست کی کہ اگر وہ اپنے علم، ذہانت یا وظائف سے یہ پتا کر کے بتا دیں کہ جنگجو کون ہے؟ کس مخلوق سے اس کا تعلق ہے؟ اور کہاں اس کی رہائش ہے؟ یا اس کی کمزوری کیا ہے؟ وائسرائے کے منہ سے جنگجو کا نام سن کر کئی عامل تو معذرت کر کے چلے گئے کہ انہیں اس قسم کا کوئی علم نہیں آتا کہ جس سے پتا لگایا جا سکے کہ جنگجو کا تعلق کس مخلوق سے ہے، وہ کیسا ہے اور کہاں رہتا ہے؟ کچھ لوگ انعام واکرام کے لالچ میں ٹھہر گئے۔ انہوں نے اپنے علم کے ذریعے حصار کھینچے، دھونی رمائی، چراغ روشن کئے لیکن ایک حد تک ان کا علم کام کر سکا۔ اسکے بعد انہیں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ لہٰذا وہ تمام بھی ناکام لوٹ گئے۔

عاملوں کے بعد وائسرائے ہند نے تمام نجومیوں، ستارہ شناس اور دیگر علوم کے عالموں کو مدعو کیا اور اپنی درخواست ان کے سامنے رکھی۔ جنگجو کے بارے میں معلومات کا سن کر نجومیوں نے سوچا کہ جنگجو کا تعلق کسی بھی مخلوق سے ہے، کسی بھی دنیا و مذہب سے ہے، کسی بھی جگہ کا رہائشی ہے یا جس حلیے میں بھی ہے وہ انسانیت کا رکھوالا ہے۔ مظلوموں کے کام آنے والا ہے اور وہ مظلوموں کی مدد کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتا کہ مظلوم ہندو، سکھ، عیسائی یا مسلمان ہیں۔ وہ تو انسانیت کے تصور کے تحت ان کی جان بچاتا ہے۔ ظلم سے نجات دلاتا ہے اور ایک ہی بلاتفریق رنگ و نسل اور مذہب کی مدد کرتا ہے۔ لہٰذا ایسے محسن انسانیت کے بارے میں بتا کر بدنصیبی مول نہیں لی جا سکتی۔ لہٰذا یہ سوچ رکھنے والوں نے بھی معذرت کر لی اور چلے گئے۔ چند نجومیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر فقط اتنا بتایا کہ وہ مشرق شمال سے آتا ہے اور مشرق جنوب میں چلا جاتا ہے۔ اس سے آگے انہیں کچھ علم نہیں ہو سکا۔ یہ اندازہ، یہ معلومات ادھوری تھی، لہٰذا وائسرائے نجومیوں کے علم

میں بھی ناکام رہا۔

اس بار وائسرائے ہند نے اپنے ملک سے روحوں کا علم رکھنے والوں کو دعوت دی اور ان کو اپنے خرچے پر ہندوستان بلا کر وہ سوالات کئے جو وہ عاملوں اور نجومیوں سے کر چکا تھا۔ روحوں کا علم رکھنے اپنے کام میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ یہ مردہ کی روح کو حاضر کر لیا کرتے تھے۔ روحوں کا علم جاننے والے عاملوں نے بھی بہت زور لگایا لیکن ان کی شرط تھی کہ اگر جنگجو ان کے سامنے ایک بار آ جائے تو وہ اس پر عمل کر کے اپنے علم سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جنگجو کسی کی بھٹکی ہوئی روح ہے یا نہیں۔ وہ اس کی جنس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس مخلوق سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ سن کر وائسرائے نے ایک بار پھر وہی منصوبہ دہرانے کی سازش تیار کی جس سے جنگجو ان کے سامنے آ سکے اور روحوں کا علم جاننے والے اس پر عمل کر کے جان سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وائسرائے نے ایک اور چالاکی کی۔ اس نے حفظ ماتقدم کے ساتھ ہندوستان میں خصوصی طور پر بنگال کے جادوگروں کو طلب کیا اور بھاری رقومات دے کر کہا کہ میں ایک منصوبے کے تحت جنگجو کو بلاؤں گا۔ تم اپنے کالے علم، سفلی علم اور جادو کے زور سے اسے فرار ہونے کا موقع نہیں دینا۔

وائسرائے کے محل میں روحوں کا علم رکھنے والے اور جادوگر بھی ہوتے تھے اور منصوبے کے مطابق عمل پیرا ہونے والے ہوتے تھے۔ دوسری طرف ہندوستان کے مرکز میں ایک شخص نے اجتماع منعقد کیا اور لاکھوں کے مجمع سے خطاب کر کے کہنے لگا۔" ہندوستان کے باسیو! اب تمہیں بھی بیدار ہو جانا چاہیے۔ خدا نے اس قوم کی حالت نہیں بدلی۔ جسے اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو۔ جنگجو جیسے فرد کب تک اکیلے لڑتے رہیں گے۔ جب تک ہندوستان کا بچہ بچہ حیدر علی، ٹیپو سلطان اور جنگجو جیسا نہیں بن جاتا، ان ظالموں کے چنگل سے آزادی ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا آج کے بعد جنگجو تمہاری مدد کے لئے نہیں آئے گا۔ اگر تم نے اپنی جنگ خود لڑ کر آزادی حاصل نہ کی۔ ہندوستانیوں کے دلوں کو بیدار

کر کے وہ رخصت ہو چکا تھا لیکن وہ اس بار مشرق شمال سے مشرق جنوب کی طرف نہیں گیا۔ بلکہ کہربن کر محل پر ٹوٹ پڑا۔ تمام جادوگروں، روح کے عاملوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ جس میں وائسرائے بھی مارا گیا تھا۔ یہ خبر سن کر ہر ہندوستانی جنگجو بن گیا اور انگریزوں پر ٹوٹ پڑا۔ یہ صورت حال دیکھ کر انگریزوں کو اعلان کرنا پڑا کہ وہ ہندوستان کو آزاد کر کے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ یہ سن کر بھی تمام ہندوستانی خوش ہو گئے۔ اور سب خدا کا شکر ادا کرنے لگے کہ ان کو اس نے آزادی دلائی۔

☆☆☆

جادوگرں کا مسکن

بادشاہ ہندوستان کو آج کل اس قسم کی شکایات بہت آ رہی تھیں کہ سندربن کے جنگلا کا سلسلہ جہاں ختم ہونے لگتا ہے وہاں سے لے کر سرحد تک کے علاقے میں جو شخص بھی آتا ہے وہ واپس نہیں لوٹتا۔ ویسے تو سندربن کا جنگل ہی کم خطرناک نہیں تھا۔ اس جنگل میں ہر قسم کے جانور آزادی سے گھومتے پھرتے تھے کیونکہ اس طرف شکاری کم آتے تھے اور یہ راستہ عام استعمال میں بھی نہیں تھا۔ جو کوئی بھٹکا ہوا شخص ادھر آ جاتا تو سمجھو درندوں کی دعوت کا انتظام ہو جاتا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ لوگ اس طرف آتے تھے جو مفرور ہوتے تھے اور قتل و غارت گری کے کیس مین پولیس یا فوج کو مطلوب ہوتے تھے وہ بھولے بھٹکے ادھر اپنی جان بچانے کے لئے یا پولیس یا پولیس کے ہاتھوں پکڑے جانے کے ڈر سے اور خود کو قید و مشقت کی مشکلوں سے بچانے کے لئے اس ویران، سنسان اور بیابان جنگل کا رخ کرتے تھے۔ انہیں پتا نہیں تھا کہ وہ جس راستے پر آ چکے ہیں اس راستے پر ان کی زندگی محفوظ نہیں ہے بلکہ موت کی طرف آ رہے ہیں کیونکہ درندے کئی کئی دن کے

بھوکے ہوتے تھے وہ انسان کے لذیذ گوشت کی خوشبو پاتے ہی ان پر ٹوٹ پڑتے تھے اور بھوک کی وجہ سے ہڈیاں تک چبا جاتے تھے ان جنگلات میں ڈاکوؤں کا گروہ رہ سکتا تھا اور اکثر ڈاکوؤں ہی نے ایسے جنگلات کو اپنا مسکن اور پناہ گاہ بنا رکھی تھی۔ ڈاکو اس جنگل میں اس لئے بھی کامیاب تھے کہ ایک تو ان کے پاس افرادی قوت زیادہ ہوتی تھی جو پہرہ بھی دیتی تھی اور نگرانی بھی کرتی تھی۔ آدھے ڈاکو ایک بار سوتے تھے اور آدھے ڈاکو جاگتے تھے۔ اس کے بعد پھر سونے والے اٹھ کر پہرہ دیتے تھے ارو جاگنے والے سو جاتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان کے پاس جدید اسلحہ ہوتا تھا جو وہ پولیس مقابلے کے لئے اپنے رکھتے تھے لہٰذا یہ اسلحہ انہیں درندوں سے بھی محفوظ رکھتا تھا۔

جب بادشاہ ہندوستان کو یہ شکایات بہت زیادہ وصول ہونے لگیں کہ سندربن کے جنگلات میں یا اس سے آگے کوئی بھی شخص جاتا ہے تو واپس نہیں لوٹتا۔ پہلے تو بادشاہ سلامت نے اسے وہم قرار دیا لیکن جب شکایات کی تعداد بڑھتی چلی گئی تو اس نے لوگوں کو بتایا کہ سندربن کے جنگلات کا پورا سلسلہ درندوں کا مسکن ہے لہٰذا اس طرف جو جاتا ہو گا اسے درندے اپنی خوراک بنا لیتے ہوں گے۔ لیکن یہ بات عوام کے مسائل کا حل نہ تھی اور نہ اس بات سے ان کی شکایات کا ازالہ ہو سکا۔ جب زور زیادہ بڑھا تو بادشاہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ بھئی ان جنگلات میں نہ صرف درندے ہیں بلکہ ڈاکوؤں نے بھی اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔ اس لئے اس طرف جانے والے انسانوں کو یا تو درندے کھا جاتے ہوں گے یا پھر ڈاکو اسے اپنا ساتھی بنا لیتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ تیسری وجہ کسی کے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بادشاہ نے کہا بھی کہ اگر واقعی درندوں اور ڈاکوؤں کا مسئلہ ہے تو جنگل کے شہری حصے کی طرف لوہے کی باڑھ لگا دیتے ہیں تا کہ درندے اس طرف نہ آ سکیں اور بھولے بھٹکے لوگ بھی اس طرف نہ جا سکیں اور اس باڑھ کے دور تک اسلحہ بردار سپاہی پہرے پر بٹھا دیتے ہیں تا کہ ڈاکو اس جنگل میں باڑھ توڑ کر داخل ہوں تو بھی پکڑے

جائیں اور اگر ڈکیتی کی نیت سے شہر میں داخل ہوں تو بھی پکڑے جائیں۔ ابھی یہ صلاح مشورے ہو ہی رہے تھے کہ بادشاہ سلامت کے کان میں ایک وزیر خاص نے آکر سرگوشی کی۔ بادشاہ سلامت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

شہزادے کی گمشدگی کا واقعہ معمولی نہیں تھا۔ شہزادہ بادشاہ کا ولی عہد اور سلطنت کا وارث تھا بلکہ اسے ہی ہندوستان کا بادشاہ بننا تھا۔ شہزادے کو اغوا کیا گیا تھا یا کسی نے قتل کر دیا تھا۔ یا پھر۔۔۔! یہ بات بادشاہ کے ذہن میں آتے ہی ان تمام لوگوں کی شکایات سامنے آگئیں جنہوں نے بادشاہ سے کہا تھا کہ سندر بن کے جنگلاتی علاقے سے آگے سرحد کے قریب کوئی علاقہ ہے جہاں سے جانے والا واپس نہیں آتا لیکن بادشاہ نے اسے لوگوں کو وہم، درندوں کا شکار ہو جانا یا ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جانا قرار دیا تھا۔ اب یہی شکایات بادشاہ سلامت کو پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ سوچوں میں ڈوب گیا کہ خدانخواستہ شہزادہ سندر بن کے جنگلات کی طرف تو شکار کھیلنے کے لئے روانہ نہیں ہوا تھا۔ کہیں درندوں نے اسے اپنی خوراک تو نہیں بنا لیا۔ لیکن شہزادہ بہت ذہین، بہادر اور بہترین تیر انداز ہے وہ درندوں سے اپنی حفاظت کرنا خوب جانتا ہے کہیں ڈاکوؤں نے اسے یرغمال تو نہیں بنا لیا اور وہ کسی بھاری رقم کے عوض اس کی بازیابی کا مطالبہ کریں۔ کاش ایسا ہی ہو کیوں کہ بھاری سے بھاری رقم ادا کر کے ڈاکوؤں سے شہزادے کو چھڑایا جا سکتا ہے لیکن خدانخواستہ درندوں نے کھا لیا تو اسے واپس نہیں لایا جا سکتا۔ یا بادشاہ کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح اورا کوندا وہ یہ کہ کہیں شہزادہ درندوں اور ڈاکوؤں سے بچ کر اسی سرحد کی طرف نہ چلا گیا ہو جس کی طرف جانے والے پلٹ کر نہیں آتے۔

اب تو محل میں ایمرجنسی کے نفاذ کا سماں لگ رہا تھا۔ بادشاہ سلامت کی نیندیں اڑ چکی تھیں۔ ہر طرف بے چینی اور اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ بادشاہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کاروائی کا آغاز کہاں سے اور کیسے کرے۔ اس نے اپنے تمام مشیروں کو بلایا اور مشورہ کیا۔

مشیر نے ڈرتے ڈرتے بادشاہ سلامت سے بہت کام کی بات کہی۔ "بادشاہ حضور! خدمت خلق عین عبادت ہے۔ جو مخلوقِ خدا کی خدمت کرتا ہے ان کی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے خدا اس کی مشکلات کو حل کر دیتا ہے کیونکہ سب سے بڑا مشکل کشا وہی ہے۔ وہی کارساز ہے اور وہی فتح و نصرت دینے والا ہے"۔ مشیر نے بادشاہ سلامت کو لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی لیکن بادشاہ پر مشیر خاص کی بات واضح نہ ہو سکی۔ "مشیر ...ا! تم کیا کہنا چاہتے ہو بلا خوف کہہ دو"۔ بادشاہ نے اس کی باتوں پر دھیان دیتے ہوئے حکم دیا۔ "میں آپ کا خادم ہوں فقط یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بادشاہ سلامت اگر عوام الناس یعنی خلق خدا کی شکایات کا ازالہ کرنے کے لئے اقدامات کریں تو ممکن ہے شہزادہ صاحب بھی بازیاب ہو سکیں۔ یعنی آپ ان کی وہ شکایات زیر غور لائیں کہ سندر بن کے جنگلات کے درندوں سے نجات، سندر بن کے ڈاکوؤں سے نجات اور سرحد کے پاس اس علاقے سے نجات جس میں جانے والے پلٹ کر نہیں آئے۔" بادشاہ سلامت! مشیر خاص کی بات کا مفہوم گہرائی تک سمجھ چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے کثیر تعداد میں افواج کو تیار کیا تا کہ سندر بن کے جنگلات سے کاروائی کا آغاز کیا جائے اور عوام الناس یا خلق خدا کو درندوں سے محفوظ کیا جائے ڈاکوؤں سے ان کی دولت اور مال و زر کو محفوظ رکھا جائے۔ اور اس کے ساتھ اس جگہ کی تحقیق و تفتیش کی جائے جس جگہ پر جانے والے پلٹ کر نہیں آتے۔

بادشاہ ہندوستان بذات خود دس ہزار افراد پر مشتمل اسلحہ بردار فوج کے ساتھ روانہ ہوئے اور انہوں نے سیدھا سندر بن کے جنگلات کا رخ کیا۔ بادشاہ کے محل یعنی دارالحکومت سے سندر بن کا فاصلہ دو دن اور ایک رات کا تھا۔ بادشاہ کا قافلہ ایک دن کی مسافت طے کر چکا تھا کہ انہیں راستے میں ایک بزرگ ملے۔ بادشاہ چونکہ دین دار اور ...لں کا قدرداں تھا۔ وہ گھوڑے کو روک کر نیچے اترا اور بزرگ کی قدم بوسی کی اور انہیں گھوڑا بطور تحفہ سواری کے لئے پیش کیا۔ بزرگ اس عزت افزائی پر بہت خوش ہوئے۔

لیکن وہ بادشاہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر حیران تھے۔انہوں نے دریا
کیا۔''بادشاہ سلامت یہ پریشانی کیسی ہے اور آپ کہاں جارہے ہیں کیا کسی دشمن فوج۔
جنگ لڑنے کے لئے جارہے ہیں؟'' بزرگ کا سوال سن کر بادشاہ سلام نے مدعا بیتمہارے
کیا۔''محترم ومکرم بزرگوار۔خلق خدا کی شکایات ہیں کہ سندر بن کا جنگلاتی علاقہ ان اگرنے
جان ومال کی حفاظت میں رکاوٹ بن گیا ہے۔درندے ان کے رہائشی افراد کو اپنی خوراک کے منہ
بنانے لگے ہیں اوران جنگلوں کو مسکن بنانے والے ڈاکوؤں کے مال وزر کو لوٹنے لی۔''مح
ہیں۔اس لئے سندر بن سے ان دونوں موذی درندوں کا صفایا کرنے کا عزم لے کرا
ہوں''۔بادشاہ کی بات سن کر بزرگ کو اطمینان نہ ہوا۔''لیکن بادشاہ سلامت یہ دونوں ہے۔ا
مسائل بتا کر آپ کے چہرے پر پریشانی چھائی ہوئی ہے تیسری وجہ بھی بتایئے''۔بزرگ شاہ سستی
چہرہ شناس تھے۔انہوں نے بادشاہ سے پریشانی کی اصل وجہ دریافت کی۔اس نتے
بادشاہ کو دل کی بات لبوں تک لانا پڑی۔''محترم وبزرگوار۔۔۔دراصل میرا بیٹا شہزادہ اپنے مش
ہوگیا ہے۔اس کی کوئی اطلاع نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔اس بے تھے
میرے مشیر خاص نے میری توجہ اس طرف مبذول کروائی ہے کہ میں فرش زمین والوں مت
مہربان ہوں گا تو عرش بریں والا مجھ پر مہربان ہوگا۔یعنی میں لوگوں کی جان ومال ہے۔
حفاظت کروں گا تو اللہ رب العزت میری اور میرے اہل وعیال کی جان ومال کی حفاظ لیا۔
کرے گا۔اس لئے میں اس کار خیر اور خدمت خلق کے لئے جارہا ہوں اور خدا سے پر کریں
امید ہے کہ وہ میرے بیٹے کو اپنی پناہ میں رکھے گا اور مجھ سے ملادے گا۔'' بادشاہ سے ا یہاں
کی پریشانی کا سن کر بزرگ کچھ دیر کے لئے خاموش رہے اور آنکھیں بند کرکے کھڑے کبھی
رہے۔کچھ دیر کے بعد انہوں نے اللہ اکبر تکبیر کہی اور بادشاہ سلامت کو اپنے گلے میں یا کو لوٹیں
ہوئی موتیوں کی مالا دیتے ہوئے کہا۔''بادشاہ سلامت آپ کا فیصلہ بالکل درست ہے ا ندوں
لئے آپ درست راستے میں جارہے ہیں۔اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دیتا ہے اسے صر منہ یا

ستقیم پر چلاتا ہے۔تم اس سیدھے راستے پر چلتے رہنا اور آخری سرحد تک پہنچ جانا۔چاہے
تمہارے راستے میں جس قدر رکاوٹیں اور مشکلات آئیں۔انشاءاللہ تم خلق خدا کی خدمت
کرنے میں بھی کامیاب ہوجاؤ گے اور اپنا دلی مدعا بھی پاجاؤ گے''۔بادشاہ نے بزرگ
کے منہ سے صراط مستقیم کی بات سنی تو مطمئن ہوگیا اور مالا کو لے کر اپنی کلائی میں باندھ
لیا۔''محترم بزرگ! کیا میرا بیٹا کسی بہت بڑی مصیبت۔۔۔۔؟''
''بس ہمیں یہیں تک بتانے کا اختیار تھا۔عقل مند کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا
ہے۔اس لئے اب تم اپنا سفر جاری رکھو اور ہاں سفر اور اپنے کام میں کسی قسم کی کوتاہی
سستی نہ کرنا ورنہ نقصان اٹھانے کا اندیشہ ہے''۔بزرگ نے بادشاہ سلامت کی بات
نتے ہوئے ہدایت کی اور یوں بزرگ اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔ادھر بادشاہ سلامت
اپنے مشن پر۔دو گھنٹے اور چلنے کے بعد رات ہوگئی تھی۔ابھی وہ پڑاؤ ڈالنے کی تیاری کررہے
تھے کہ انہیں ایک ایلچی ملا جو کہ ڈاکوؤں کی طرف سے پیغام لایا تھا۔وہ بادشاہ کی
خدمت میں پیش کیا گیا۔پیغام میں لکھا تھا۔''بادشاہ سلامت شہزادہ ہمارے قبضہ میں
ہے۔یہ شکار کھیلتا ہوا ادھر آنکلا تھا اور ہم نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اپنا قیدی
بنالیا۔اگر آپ نے ہمارے ایلچی کو قید کیا تو ہم شہزادے کو تکلیفیں دیں گے اور اس پر تشدد
کریں گے۔ہاں ہمارا مطالبہ ہے کہ سندر بن کو فقط ڈاکوؤں کے لئے وقف کردیا جائے۔
ہم یہاں رہ کر اپنی کاروائیاں سرانجام دیتے رہیں گے۔لیکن آپ سے ہمارا وعدہ ہے کہ ہم
کبھی بھی حکومت کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے نہ کبھی حکومت کے شاہی قافلوں
کو لوٹیں گے۔اگر آپ کو یہ منظور ہو تو آپ واپس تشریف لے جائیں اور سندر بن کو،
درندوں کا یا ڈاکوؤں کو مٹانے یا ختم کرنے کا خیال دل سے نکال کر یہیں سے لوٹ جائیں
ورنہ یاد رہے آپ کا شہزادہ ہمارے قبضے میں ہیں''۔یہ پیغام پڑھ کر بادشاہ سلامت کا چہرہ
غصے سے تمتما اٹھا لیکن اس نے برداشت کرتے ہوئے اس ایلچی کے ہاتھ جوابی پیغام روانہ

کیا۔ ”ڈاکوؤں کے سردار تمہیں دولت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ہر مہینے ہم تمہیں دو ہزار اشرفیاں دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ بشرطیکہ تم لوگوں کا مال و اسباب لوٹنا چھوڑ کر سدھر جاؤ اور اپنے گھناؤنے کام سے باز آجاؤ اور شہزادے کو رہا کرنے کے عوض ہم تمہیں اپ فوج میں بھرتی کرنے کا وعدہ کرتے ہیں کیونکہ تم لوگ اسلحہ بردار ہوتے ہو۔ اچھے نشا باز، بہادر اور جری اس لئے تمہیں ہماری دونوں شرائط مان لینا چاہیے۔ ان شرائط کو ما میں سراسر تمہارا ہی فائدہ ہے۔ ایک تو تم گناہ کے کاموں سے باز رہو گے اور رزق حرا کے بجائے رزق حلال کماؤ گے اور کھاؤ گے۔ پھر تمہاری بہادری اور یہ جنگجو طبیعت گناہ ک کاموں میں صرف ہونے کی بجائے ملک و قوم کی حفاظت میں لگے گی۔ میں تمہار جواب کا منتظر رہوں گا“۔ بادشاہ سلامت کا یہ صلاح نامہ لے کر ایلچی روانہ ہو گیا۔ را کو آرام کرنے کے بعد صبح قافلہ تیار ہو کر روانہ ہو گیا۔

پورا دن سفر کرنے کے بعد قافلہ ایک وادی میں پہنچا۔ یہ وادی شہری آبادی ا آخری حدود میں شامل تھی۔ یہاں سے جنگلات کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ سپہ سالا نے بادشاہ سے پڑاؤ ڈالنے کے لئے پوچھا تو بادشاہ سلامت نے کہا۔ ”آج مسلسل را میں بھی سفر جاری رکھنا ہے۔ یہ پوری رات سفر طے کرنے کے بعد ہماری منزل قریب آجائے گی اور تب ہمیں وہیں سے کارروائی شروع کرنی ہے“۔ بادشاہ سلامت کا اعلان ا حکم سن کر سب نے اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کی رفتار بڑھا دی۔ آگے آگے مشعل بردار چل رہے تھے تاکہ راستہ نظر آتا رہے اور سفر آسانی سے جاری رہے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ایک شخص جس کا حلیہ بڑا عجیب و غریب تھا اس کے بال گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے اور ا کی مونچھیں اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ شاید کئی سالوں سے ان کو ترشوایا نہیں گیا تھا۔ پ پرانے کپڑوں میں ملبوس تھا بلکہ اس کے جسم پر چیتھڑے ہی لٹک رہے تھے۔ وہ اچانک درخت کے اوپر سے اتر کر قافلے کے سامنے آگیا۔ چند سپاہیوں نے اسے پکڑنا چاہا لیکن

اس نے اشارے سے منع کر کے کہا۔ مجھے بادشاہ یا امیر کارواں سے بات کرنی ہے یا تمہارا سالار اعظم ہو؟ سالار نے یہ بات بادشاہ سلامت تک پہنچائی جو قافلے کے وسط میں سفر کر رہا تھا۔ بادشاہ کے حکم پر اسے بادشاہ کے روبرو پیش کیا گیا۔ ”تم کون ہو؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟“ بادشاہ سلامت نے اس سے کئی سوال کر ڈالے۔

”میں ایک جادوگر ہوں، یہاں سے آگے جانے والوں کو تنبیہ کرتا ہوں اور آپ سے بھی یہی بات کرنی ہے کہ یہاں سے آگے نہ جانا ورنہ نقصان میں رہو گے!“ جادوگر کی دھمکی سن کر بادشاہ کو تجسس ہوا کہ اس شخص کا اس علاقے سے کیا تعلق ہے۔ ”سچ سچ بتاؤ کیا تم ڈاکوؤں کے ساتھی ہو یا ان کے لئے مخبری کرتے ہو؟“ بادشاہ نے ذرا غصے سے دریافت کیا۔ ”نہ میں ڈاکو ہوں اور نہ ان کا مخبر۔ میں تو سندر بن سے آگے جانے والوں کو ہدایات کرنے کے لئے کئی سالوں سے اس جگہ رہتا ہوں۔ میں ان کو سمجھاتا ہوں کہ کبھی ان جنگلوں سے آگے مت جاؤ۔ واپس نہیں لوٹ پاؤ گے۔ لیکن کوئی سنتا ہی نہیں ہے کیونکہ انسان کی فطرت ہی عجیب ہے۔ جس چیز سے اس کو روکا جائے وہ وہی کام ضرور کرتا ہے“۔ جادوگر کی باتیں اچھی تھیں اس لئے بادشاہ سلامت نے اس سے معلومات کے لئے پوچھا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں معلوم ہے کہ اس سندر بن سے آگے کیا ہوتا ہے؟ وہاں کون سی مخلوق رہتی ہے جو جانے والوں کو واپس نہیں آنے دیتی!“ بادشاہ کی بات سن کر جادوگر پہلے تو خاموش رہا لیکن پھر خود ہی بتانے پر مجبور ہو گیا کیونکہ ایک تلوار بردار سپاہی نے اس کی گردن پر تلوار رکھ دی تھی۔ ”بادشاہ سلامت سندر بن سے آگے جادونگری ہے وہ پورا علاقہ جادوگروں کے قبضے میں ہے وہاں جو بھی جاتا ہے وہ جادوگر اسے پتھر کا بنا دیتے ہیں۔ یا اس پر عمل کر کے سفلی علوم کے نت نئے تجربات کرتے ہیں اور اسے اپنی قید میں رکھتے ہیں۔“ جادونگری کا نام سن کر بادشاہ کو حیرانی ہوئی کیونکہ عوام نے آج تک جتنی

بھی شکایات کی تھیں ان میں جادونگری کا کہیں نام استعمال نہیں ہوا تھا شاید اس جگہ کا نام کسی کو معلوم نہ ہوا ہو۔ لیکن اشارے سبھی اس جادونگری کی طرف تھے۔ ''اچھا تو میاں جادوگر یہ بتاؤ کہ کوئی شاہی فرد بھی اس طرف گیا ہے۔ جس کو تم نے منع کیا ہو اور وہ نہ مانا ہو اور اس جنگل میں چلا گیا ہو۔ بادشاہ سلامت کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ''ہاں بادشاہ سلامت! ایک شاہی لباس میں ملبوس جو شکل وصورت سے شہزادہ لگ رہا تھا سب سے آخر میں وہی ملا تھا میں نے اسے جادونگری سے ڈرایا۔ درندوں سے خوف دلایا اور ڈاکوؤں سے لٹنے کا ذکر کیا مگر وہ یہ کہہ کر اس جنگل کی طرف روانہ ہو گیا کہ مجھے خطروں سے کھیلنے کا شوق ہے۔ بادشاہ نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی کہ اس کا بیٹا خیریت سے ہو اور اسے خراش تک نہ آئے۔ ''تو اس کا مطلب ہے میرا اکلوتا بیٹا شہزادہ واقعی ڈاکوؤں کے قبضے میں ہے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے ٹھیک مجھے پیغام بھیجا تھا۔ مجھے اس کی بات مان لینی چاہیے تھی۔'' بادشاہ نے جادوگر کو خریدتے ہوئے مزید دریافت کیا۔ ''ہاں بادشاہ سلامت۔ آپ کا شہزادہ اس طرف گیا ضرور تھا مگر وہ درندوں اور ڈاکوؤں کے پاس نہیں پہنچا۔ وہ جادونگری میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد آپ کو معلوم ہے وہاں پر جانے والا لوٹ کر نہیں آتا۔'' اتنے وقت تک باتیں کرنے کے بعد بادشاہ کو خیال آیا کہ یہ شخص بھی جادوگر ہے۔ پھر یہ جادونگری میں جانے سے کیوں روک رہا ہے؟ ''جادوگر یہ بتاؤ تم جادونگری سے کیوں نکالے گئے ہو؟ جو ان کے خلاف ہو گئے اور اب جادوگری میں لوگوں کو جانے سے روک رہے ہو؟'' بادشاہ سلامت کا سوال سن کر اس کے چہرے پر غضب ناک کے آثار نمودار ہو گئے۔ ''بادشاہ سلامت میں بھی جادوگر ہوں مگر میں سینے میں دل رکھتا ہوں ایک بار جادوگر ایک لڑکی کو جادو کے زور پر اٹھا لائے۔ بہت نیک اور شریف لڑکی تھی۔ اس نے انہیں اللہ اور رسول کے واسطے دیئے کہ اسے چھوڑ دیں لیکن جادوگروں پر طاقت کا نشہ طاری تھا پھر وہ پہلونٹی کی بیٹی تھی۔ اس کا خون پینے سے ایک سفلی عمل کی تعمیل

ہوتی ہے۔ اس لئے انہوں نے وہ کام کیا اور لڑکی کی لاش درندوں کو کھلا دی۔ اس بات پر میں ان ظالم اور سفاک لوگوں سے الگ ہو گیا''۔ بادشاہ اس کی کہانی سن کر سمجھ گیا کہ یہ جادوگر سدھر سکتا ہے۔ ''جادوگر۔۔۔۔ اگر تم اپنے تمام پچھلے گناہوں سے تائب ہو کر سچے دل سے توبہ کر لو تو میں تمہیں نہ صرف محل میں جگہ دے سکتا ہوں بلکہ اپنا خاص مشیر رکھ سکتا ہوں۔'' بادشاہ کی پیشکش سن کر اس کو اپنے دن پھیرنے کا خیال آ گیا۔ ''ٹھیک ہے بادشاہ سلامت میں توبہ کر کے آپ کے ساتھ ملنے کے لئے تیار ہوں''۔ یہ خوشخبری سن کر بادشاہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اسے ایک جادوگر کو راہ راست پر لانے کا ذریعہ بنایا۔ بادشاہ کے سپاہیوں نے اسے ہاتھ منہ دھلوا کر نیا لباس پہنا دیا اور اپنے ساتھ گھوڑے پر سوار کر لیا۔ قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔ جادوگر نے لشکر کو بتایا کہ یہ چھوٹا راستہ سیدھا جادونگری کو جاتا ہے۔ لیکن اس چھوٹے راستے کو اختیار کرنے سے بادشاہ نے منع کر دیا۔ کیونکہ اسے اپنے مشن کی تکمیل کرنا تھی۔ درندوں اور ڈاکوؤں کو ختم کرنا تھا۔ اس لئے وہ مسلسل سفر طے کرتے ہوئے سندر بن کی حدود تک جا پہنچے۔ بادشاہ سلامت نے ایک نظر اس خوف ناک اور گھنے جنگل پر ڈالی اور اپنی تمام فوج کو حکم دیا کہ اسے کاٹ کہ رکھ دے۔ فوج نے حکم پاتے ہی درختوں کو ایک سرے سے کاٹنا شروع کر دیا۔ دس ہزار آدمیوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پانچ ہزار درختوں کو کاٹ ڈالا۔ وہ درخت کاٹتے گئے اور آگے بڑھتے گئے ان کے راستے میں کئی درندے آئے حملہ آور ہوئے لیکن ماہر تیر اندازوں نے انہیں مار دیا۔ یہ عجیب کاروائی دیکھ کر درندے سہم کر سرحد کی طرف دوڑنے لگے۔ اس درندوں کی بھگدڑ میں ڈاکوؤں کا بھی بہت نقصان ہوا۔ کہتے ہیں زخمی شیر زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ درندوں نے جنگل کے درمیان میں آنے والے ڈاکوؤں کو نشانہ بنایا اور خود بھی نشانہ بنے۔ اس طرح گھنٹوں کی تگ ودو اور محنت ومشقت کے بعد وہ آدھے سے زیادہ درخت کاٹ کر فاصلہ طے کر چکے تھے۔ یکدم دور سے انہوں نے ایک شخص کو دوڑ کر آتے دیکھا۔ وہ شخص قریب آ کر

کہنے لگا۔" میں ڈاکوؤں کا قاصد ہوں اور پیغام لے کر آیا ہوں کہ اگر شاہی فوج نے یہ کاروائی بند نہ کی تو وہ شہزادے کو مار ڈالیں گے"۔ بادشاہ نے سن کر کہا۔" قاصد جاؤ۔ جا کر کہہ دو کہ ہمیں معلوم ہے شہزادہ تمہارے قبضے میں نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو تم اپنا کام کرو ہم اپنا کام کرتے ہیں"۔ بادشاہ کی بات سن کر وہ شخص دوڑا گیا اور دور کھڑے گھوڑے پر سوار ہو کر سرحد کی طرف چلا گیا۔ صبح ہونے تک جنگلات کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ درندے مارے گئے تھے اور کچھ ڈاکوؤں نے مار دیئے تھے باقی جو بچے تھے وہ جادونگری میں بھاگ گئے ہوں گے جنہیں جادوگروں نے جادو سے پتھر کا بنا دیا ہوگا۔ کچھ حال ڈاکوؤں کا ہوا۔ کچھ ڈاکو درندوں کی خوراک بن گئے کچھ نے شاہی لشکر سے مقابلہ کیا۔ جو مار دیئے گئے اور جو کچھ بچے ہوں گے وہ جادوگروں کے کام آ گئے ہوں گے۔

کل تک جہاں جنگل، بیابان اور ویران و سنسان علاقہ تھا جو جگہ درندوں کی کچھار بنی ہوئی تھی اور ڈاکوؤں کا مسکن تھی آج ایک رات کی ہمت افزا کاروائی سے میدان نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف درخت ہی درخت بکھرے ہوئے تھے۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ ماحول خوشگوار اور فضا سازگار نظر آ رہی تھی۔ سندر بن کی آخری حد پر وہ کھڑے تھے۔ سامنے صاف میدان تھا اور سینکڑوں میلوں تک آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ جادوگر نے بتایا کہ یہاں سے جادونگری کی حد سے شروع ہوتی ہے اس لئے اس سے آگے ہر ہر قدم خطرناک ہو سکتا ہے۔ نہ جانے کس موڑ پر انہیں جادوگروں کا سامنا ہو جائے اور ان پر جادو اثر کر جائے۔ بادشاہ سلامت کے سامنے میدان جنگ کے خطرات تو بہت آئے تھے لیکن اس قسم کے خطرات سے اسے پہلی بار سامنا تھا۔ اس میں حفاظتی تدابیر کیا ہو سکتی تھیں یہ بھی پتا نہیں تھا بہرحال بادشاہ سلامت نے تمام شاہی لشکر کو وہیں ٹھہرے رہنے کا حکم دیا اور خود دو چار جنگجو ساتھیوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ جادوگر جس کا نام بادشاہ نے بدل کر محمد خالد رکھ دیا تھا۔ شاہی لشکر میں شامل تھا۔ یہ سب گھوڑوں پر سوار تھے اور لگاتار احتیاط

کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔" اور آگے مت آنا بادشاہ سلامت، ہماری آپ سے یا شاہی لشکر سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ سے الجھا جائے"۔ شاہی لشکر نے اور اس کے کانوں نے یہ آواز تو سنی لیکن آواز دینے والا نظر نہ آ سکا۔ بادشاہ اور اس کے ساتھیوں نے گھوم کر ادھر اُدھر دیکھا لیکن کچھ نظر نہ آیا۔" بادشاہ سلامت یہاں پر آپ کو کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ جو دیکھے گا وہ ہوگا نہیں اور جو ہوگا وہ دکھے گا نہیں"۔ بادشاہ یہ بیان سن کر حیران ہوئے بنا نہ رہ سکا۔" بادشاہ سلامت دائیں ہاتھ پر واقع ٹیلے پر بیٹھا پرندہ یہ آواز نکال رہا تھا۔ دراصل وہ پرندہ نہیں ہے ایک جادوگر ہے جو جادو کے زور سے پرندہ بنا بیٹھا ہے۔ وہ جب چاہے پرندہ بن جاتا ہے اور جب چاہے جادوگر بن جاتا ہے"۔ جادوگر جواب محمد خالد تھا جس نے بادشاہ کو خبر دی۔ بادشاہ نے ایک تیرانداز کو اشارہ کیا کہ وہ نشانہ لگائے اور پرندے کو اڑنے کی اجازت نہ دے۔ تیرانداز نے ایسا نشان مارا کہ پرندہ پھڑپھڑا کر نیچے گرا اور بے جان ہو گیا۔

بادشاہ سلامت کچھ آگے بڑھا تو اسے ایک کنواں دکھائی دیا لیکن کنویں کا منہ اینٹوں سے تعمیر کر کے بند کر دیا گیا تھا اور سب سے حیرت کی بات تھی کہ کنویں کے منہ کے عین درمیان میں ایک شخص کا سر گردن سمیت چنا ہوا تھا۔ بادشاہ نے بغور دیکھا تو اسے پتا چلا کہ جادوگروں نے اس شخص کو جادو سے پتھر کا بنایا ہوا ہے۔ بادشاہ سلامت اسے ہاتھ لگا کر دیکھنا چاہتے تھے جیسے ہی بادشاہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا سامنے سے دو انسانی ڈھانچے چلتے ہوئے آئے اور بادشاہ کو خوف زدہ کرنے لگے۔ لیکن بادشاہ پھر بھی باز نہ آیا اور آگے بڑھنے لگا۔ اس کا پاؤں کسی پتھر سے ٹکرایا۔ اس نے دیکھا تو اس کا پاؤں کسی پتھر سے نہیں بلکہ ایک انسانی کھوپڑی سے ٹکرایا تھا۔ بادشاہ عجلت میں اٹھنے لگا تو اس کی کلائی میں بندھی ہوئی موتیوں کی وہ مالا جو اسے بزرگ نے عطا کی تھی اس کھوپڑی سے جا لگی۔ مالا کھوپڑی سے مس ہوتا تھا کہ ایک زوردار چیخ گونجی اور انسانی ڈھانچے غائب ہو گئے۔ محمد

خالد پر حیرانی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ حیران تھا کہ بادشاہ کے پاس تو ان جادوگروں کے جادو کا توڑ موجود تھا۔ ”بادشاہ سلامت یہ کیا ہے؟ مجھے بھی دکھائیں۔“ محمد خالد نے مالا کو چھونے کے لئے خواہش ظاہر کی۔ ”محمد خالد تمہیں محل میں جا کر اس مالا کی حقیقت بتا دوں گا۔ ابھی اس سے بہت کام لینے ہیں“۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے کنویں کے منہ پر اینٹوں سے چنی گردن کو مالا لگائی تو وہ گردن ہلنے لگی اور اس کا منہ بات کرنے لگا۔ ”بادشاہ سلامت! ہم آپ کی رعایا میں سے ہیں۔ اس کنویں میں پتھر ہی پتھر بھرے ہیں جو دراصل سب انسان ہیں جادوگر نے ہمیں پتھر کا بنا دیا ہے۔ بادشاہ نے کنویں کو کھدوا کر سب پتھروں کو نکالا اور مالا لگاتا گیا اب وہ انسان بن گئے۔ انہوں نے انسان کی شکلوں میں واپس آنے کے بعد ایک ایک جادوگر کا ٹھکانہ بتا دیا۔ بادشاہ سلامت نے اپنی فوج کو بھی بلوا لیا۔ وہ سب ایک ایک جادوگر کو پکڑتے اسے نیک بننے اور جادو کے کاموں سے تائب ہونے کی دعوت دیتے، انکار کی صورت میں مالا اس کے جسم پر پھیر دیتے۔ مالا پھیرتے ہی ان کا سارا جادو ختم ہوتا گیا۔ کچھ جادوگروں نے بادشاہ کی فرماں برداری قبول کر لی جو فائدہ میں رہے۔

تائب ہونے والے لوگوں میں سے ایک شخص نے بتایا کہ شہزادے کو جادوگروں کا سردار بھینٹ چڑھانے سامنے پہاڑی پر لے گیا ہے۔ بادشاہ نے سرپٹ گھوڑا دوڑایا اور جلد وہاں پہنچا دیکھا تو شہزادہ اس کی قید میں تھا۔ پہلی فرصت میں جادوگر سے مالا کو مس کیا تو اس کا سارا جادو ختم ہو گیا۔ شہزادہ بھی ٹھیک حالت میں بھی اس کے جادو کے اثر سے باہر آ گیا۔ بادشاہ نے جادوگروں کے سردار کو بھی دعوت حق پیش کی لیکن انکار کی صورت میں اسے وہیں چھوڑ کر واپس ہو لئے۔ اب تمام جادوگر بالکل عام انسان تھے ان کا تمام علم مٹی میں مل چکا تھا۔ بادشاہ اپنے نیک مشن میں کامیاب ہو چکا تھا۔ واقعی اس نے خلق خدا کی حفاظت کی اور خدا نے اس کے اکلوتے بیٹے کو اپنی پناہ میں رکھا۔

☆☆☆

عامل بابا اور جادوگرنی

دوپہر کا وقت تھا۔ سورج سر پر تھا۔ دھوپ کی شدت نا قابل برداشت تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف سے کالے بادل اٹھے اور پلک جھپکتے میں آسمان پر چھا گئے۔ یہ کالی کالی گھٹائیں تھیں۔ جنہوں نے پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ گھٹائیں اس قدر گھنگھور تھیں کہ انہوں نے دوپہر کے وقت کو شام کا سہانا منظر بنا دیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور کچھ اپنے گھر کی چھتوں پر چڑھ کر خنکی بھری آوازوں کا مزہ لینے لگے۔ بچوں نے گلیوں میں ایک شور مچا رکھا تھا۔ ہر طرف چہل پہل ہو رہی تھی۔

آہستہ آہستہ بادلوں نے برسنا شروع کیا اور بارش موسلا دھار ہونے لگی۔ بارش نے ہر چیز کو جل تھل کر دیا تھا۔ بچے بوڑھے اور جوان یہاں تک کہ عورتیں بھی دھوپ کی جھلسا دینے والی حدت سے تنگ آ کر بارش میں نہانے لگیں۔

یہ شاید کوئی ویرانہ تھا جہاں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس قدر خاموشی تھی کہ بارش کے قطرے گرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہاں کوئی انسان آدم زاد دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دور بہت دور ایک سایہ ناچ رہا تھا۔ کوئی بے حد خوش تھا اور اس خوشی کے اظہار میں بے حد ناچ رہا تھا۔ اتنے میں سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک آواز سنائی دی۔

”آج جادوگروں کی ملکہ بہت خوش ہے۔ آج میرا انتظار ختم ہونے والا ہے۔ وہ گھڑی آنے والی ہے جس کا میں نے بڑی دیر سے انتظار کیا ہے۔ آج وہ بچی پیدا ہونے والی ہے جس کے بال روز بہ روز لمبے اور لمبے ہی ہوتے جائیں گے۔ ان بالوں ہی کی وجہ

سے وہ شہزادی بنے گی اور پھر میں اس کے ذریعے راج محل پر قبضہ جمالوں گی اور یوں پوری دنیا پر میرا راج ہوگا۔ صرف میرا۔ میں جادوگروں کی ملکہ، پوری دنیا کی ملکہ بن جاؤں گی۔ تب میری شکتیاں دوگنی ہو جائیں گی، ہا۔۔۔ہا۔۔۔ہا''

بارش تھم چکی تھی۔ آسمان صاف ہو چکا تھا۔ گھٹائیں برس برس کر واپس جا چکی تھیں۔ اکرم صاحب دفتر ہی میں رک گئے تھے۔ بارش تھمی تو وہ مشکل سے گھر گئے۔ اکرم صاحب نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا ان کو ایک نومولود بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ان کی بیوی نے خوشخبری سنائی کہ ان کے ہاں ایک ننھی منی اور بہت ہی پیاری بیٹی نے جنم لیا ہے۔ اکرم صاحب فوراً پالنے کی طرف لپکے۔ دیکھا تو پالنے میں ایک بہت ہی چھوٹی سی گڑیا سو رہی تھی۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بچی کے بال پیدائشی سنہرے اور لمبے ہیں۔ اکرم صاحب نے بچی کو پیار کیا اور اپنی بیوی کی خیریت پوچھی۔

وقت گزرتا گیا اور بچی جس کا نام لینیٰ رکھا گیا تھا۔ پہلے بیٹھنے لگی پھر پیٹ کے بل چلنے اور پھر آہستہ آہستہ کھڑی ہونے لگی۔ یوں اس نے سہارا لے کر چلنا سیکھ لیا تھا۔ وہ ایک سال کی وہ چکی تھی۔ آج لینیٰ کی سالگرہ تھی۔ جہاں دوسرے رشتہ دار سالگرہ میں آئے وہاں ایک اجنبی عورت بھی مہمانوں میں شامل تھی۔ وہ بار بار لینیٰ کے بالوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ مہمانوں سے بات بھی کر رہی تھی تو لینیٰ کے بارے میں کر رہی تھی اس عورت کی آنکھیں بہت موٹی موٹی تھیں جن سے مہمانوں کو ڈر بھی آ رہا تھا۔ سب نے لینیٰ کو پیار کیا۔ اس کی سالگرہ پر تحفے دیئے اور اپنے اپنے گھر کو چلے گئے۔ سب سے آخر میں جانے والی وہی عورت تھی۔ اس نے آخری بار لینیٰ کے بالوں کو چھو کر دیکھا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

''امی! یہ عورت کون تھی۔ میں نے تو اس کو پہلی بار دیکھا ہے'' لینیٰ کی امی نے لینیٰ کے ابو سے پوچھا۔

''مجھے بھی پتا نہیں کہ وہ کون تھی مجھے تو اس کی آنکھوں سے ڈر آ رہا تھا'' لینیٰ کے ابو نے بتایا۔

ہر سال اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ یہاں تک کہ لینیٰ بڑی ہوگئی۔ ایک روز وہ سکول سے واپس آ رہی تھی کہ اسے راستے میں ایک عمر رسیدہ عورت ملی۔ اس عورت کو کسی کے سہارے کی ضرورت تھی وہ حسرت بھری نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ لینیٰ کو اس پر بہت ترس آیا۔ لینیٰ نے اس عورت سے پوچھا۔

''بڑی بی آپ کو کہاں جانا ہے؟''

''بیٹی وہ سامنے اس وادی میں میری کٹیا ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر تم مجھے میری کٹیا تک پہنچا دو گی''۔ عورت نے لینیٰ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں بڑی بی میں تمہیں تمہاری کٹیا تک چھوڑ آتی ہوں۔ لیکن بڑی بی تم کس کام سے یہاں تک آئی تھیں'' لینیٰ نے بڑی بی سے یہاں تک آنے کی وجہ پوچھی۔

''بیٹی آج میری مراد پوری ہونے والی ہے۔ مجھے میرے صبر اور انتظار کا پھل ملنے والا ہے''۔

بڑی بی باتیں کرتی جا رہی تھیں اور اس کی رفتار میں تیزی آتی جا رہی تھی۔

''آپ کی کمزوری تو دور ہوگئی ہے۔ اب تو آپ اکیلی چل کر جا سکتی ہیں۔ کیا میں اپنے گھر جاؤں؟'' لینیٰ نے بڑی بی سے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں اب تم کہیں نہیں جا سکتیں۔ میں نے بہت انتظار کیا ہے۔ تیرے پیدا ہونے کا۔ تیرے بڑے ہونے کا اور تجھ پر جوانی دیکھنے کا۔ آج میں تیرے راستے میں اس لئے آئی تھی کہ تجھے اپنے ساتھ لے آؤں۔ میں تیری ہی تلاش میں یہاں تک پہنچی تھی۔ اب میں تجھے کہیں نہیں جانے دوں گی''۔ یہ کہہ کر بڑی بی نے لینیٰ کے ہاتھ کو اس مضبوطی

سے پکڑ لیا کہ ہزار ہا کوشش کے بعد بھی لبنیٰ اس سے ہاتھ چھڑا نہ سکی۔لبنیٰ کے چہرے کا رنگ
پھیکا پڑ گیا تھا۔وہ دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھی کہ اس مصیبت سے کیسے جان چھڑائی
جائے کیونکہ اس نے تو نیکی کی تھی۔ایک انسان کو ضعیف سمجھ کر خدمت اور مدد کی تھی۔یہ اس
کو نیکی کا صلہ ملا۔جادوگرنی اپنے اصل روپ میں آ گئی تو لبنیٰ کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔
کیونکہ جادوگرنی کے ہاتھوں پیروں کے ناخن بڑے بڑے ہو گئے تھے۔اس کے
گھنگھریالے بال عجیب انداز سے مڑے ہوئے تھے۔اس کے ہاتھ میں ایک جادو کی
چھڑی بھی آ گئی تھی۔جس کے ایک سرے پر انسانی ٹانگ کی ہڈی تھی اور جادوئی چھڑی کے
دوسرے سرے پر انسانی کھوپڑی بنی ہوئی تھی۔لبنیٰ بری طرح پھنس چکی تھی۔کوئی راستہ نہیں
تھا۔اس نے جادوگرنی کی منتیں کیں، واسطے دیئے۔اس کے آگے روئی، گڑگڑائی کہ وہ
اسے گھر جانے دے لیکن جادوگرنی نے اس کی ایک بھی فریاد نہ سنی۔وہ لبنیٰ کو ایک جنگل میں
لے آئی جہاں کچھ فاصلے پر ایک ایسی عمارت تھی جس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔عمارت
بہت بلند و بالا اور لمبائی کے رخ پر بنی ہوئی تھی۔عمارت کی چھت کے قریب صرف ایک
کھڑکی تھی۔جادوگرنی نے یاسمین کو اس کھڑکی کے ذریعے عمارت میں داخل کیا اور قید کر
دیا۔لبنیٰ اسے آوازیں دیتی رہی اور اس سے نجات کے لئے منتیں کرتی رہی لیکن اس نے
ایک نہ سنی اور ناچتی ہوئی غائب ہو گئی۔

ادھر لبنیٰ کے ابو جان بہت پریشان تھے کہ ابھی تک لبنیٰ گھر نہیں پہنچی تھی۔انہوں
نے لبنیٰ کو سکول جا کر بھی دیکھا لیکن سکول کے اسٹاف نے بتایا کہ وہ تو چھٹی کر کے کب سے
جا چکی ہے۔اس کے ابو راستے میں بھی اسے تلاش کرتے رہے لیکن لبنیٰ کا کہیں پتا نہ چلا۔
لبنیٰ کی امی کا رو رو کر برا حال تھا۔انہوں نے تمام رشتہ داروں کے گھر جا جا کر لبنیٰ کے
بارے میں پوچھا لیکن سب نے یہی جواب دیا کہ لبنیٰ یہاں نہیں آئی۔

ابھی لبنیٰ کے والدین کا رونا دھونا جاری تھا کہ ان کے گھر کے دروازے پر ایک

فقیر نے صدا لگائی۔"بابا کچھ کھانے کو دو، بابا بہت بھوکا ہے"۔

"بابا آج گھر میں کچھ نہیں ہے۔آج ہم سب بہت بڑی مصیبت میں گرفتار
ہیں۔اس لئے نہ کچھ پکایا اور نہ کچھ کھایا ہے"۔اس کی امی نے بابا کو بتایا۔

"کیا مصیبت ہے بچہ، ہمیں بھی بتاؤ، ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری مشکل کو آسان
کر دیں"۔بابا نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"بابا ہماری اکلوتی بیٹی سکول گئی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی۔ایک تو مدتوں
انتظار کے بعد ہم نے اولاد جیسی نعمت دیکھی تھی اور پھر یہ مصیبت کہ وہ ابھی تک گھر نہیں
آئی"۔لبنیٰ کے والد نے بابا کو پوری بات بتائی۔

"آپ بابا کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائیں، بابا تم کو خبر دے گا کہ تمہاری بچی
کہاں ہے"۔بابا نے اتنے اعتماد سے کہا کہ ان کو تسلی ہوئی۔وہ بابا کو گھر کے اندر لے گئے۔
لبنیٰ کی امی نے جلدی سے آٹا گوندھا اور لبنیٰ کے ابو جلدی جلدی انڈے بھوننے لگے۔وہ
دونوں کھانا تیار کر رہے تھے۔جبکہ بابا زائچہ بنانے میں مصروف تھا۔بابا نے اپنے اردگرد
ایک بڑا سا حصار کھینچ لیا تھا اور ہزار دانوں کی تسبیح پر کچھ پڑھتے جا رہے تھے۔اس دوران
ان کی آنکھیں بند تھیں۔

"کھانا تیار ہے بابا"۔لبنیٰ کی امی نے بابا کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے ادب
سے کہا۔ہزار دانوں کی تسبیح پوری کر کے بابا نے آنکھیں کھول دیں۔

"بابا کچھ پتا چلا۔ہماری ننھی منی، بھولی بھالی بچی کہاں ہے؟ کس حال میں
ہے؟"لبنیٰ کی امی نے بہت بے تاب ہو کر بابا سے پوچھا۔

"ہاں کچھ خبر ملی ہے لیکن کھانا کھانے کے بعد بڑا عمل کرنا پڑے گا۔تب جا کر
مسئلہ حل ہوگا۔اور صورت حال نمایاں ہوگی"۔بابا نے ان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔بابا یہ لو کھانا اور خدا کے لئے ہماری بچی کے بارے میں

ہمیں بتا دو، وہ تو کبھی ہم سے اتنی دیر دور نہیں رہی۔۔۔" لیلیٰ کی امی نے روتے ہوئے کہا۔

بابا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا اور کھانا کھانے لگا۔ بابا بہت جلد کھانے سے فارغ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات تھے۔ بابا نے ایک بار پھر ہزار دانوں کی تسبیح کو پڑھنا شروع کیا۔ بابا کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئی تھیں۔ کافی دیر کے بعد ایک عجیب و غریب آواز ابھری۔

"بڑھیا۔۔۔ بتا تو نے لیلیٰ کو کیوں اغوا کیا ہے؟" بابا نے بہت جلدی میں کہا۔

"میں نے برسوں اس کا انتظار کیا ہے۔ میں اس کو شہزادی بناؤں گی۔ ہمار۔ پڑوسی ملک کے راجہ کا بیٹا شہزادہ احمد ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے انتہائی لمبے، گھنے، سنہرے اور ریشمی و چمک دار ہوں۔ اور یہ ساری باتیں لیلیٰ میں موج ہیں۔ اس کے بال انتہائی گھنے، ریشمی، چمک دار اور لمبے ہیں۔ شہزادہ احمد اسے دیکھتے ہی شادی کے لئے تیار ہو جائے گا اور میں لیلیٰ پر جادو کے ذریعے چھا جاؤں گی۔ لیلیٰ کی مدد۔ اس کے راج محل پر قبضہ جما لوں گی۔ سب کو جادو کے ذریعے مار دوں گی اور خود ملکہ بن جاؤں گی۔ پھر مجھے لیلیٰ کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی تب میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گی"۔ جادوگرنی نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

"نہیں تمہیں لیلیٰ کو آزاد کرنا ہوگا ورنہ اس کے ماں باپ رو رو کر مر جائیں گے"۔ بابا نے اسے باتوں میں لگانے کی بھرپور کوشش کی اور بابا اپنی کوشش میں نہایت کامیاب بھی رہا۔ نہ جانے اس بحث کا مقصد کیا تھا۔ دونوں گھنٹوں بحث میں الجھے ر۔ اور لیلیٰ کے ماں باپ حیرانی سے دونوں کا جھگڑا ہوتے ہوئے دیکھتے رہے اور اپنی بیٹی کی خبریں سنتے رہے۔

ادھر لیلیٰ کھڑکی میں کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی لیکن اس ویران اور سنسا

...ل میں اسے کوئی جانور بھی دکھائی نہ دیا۔ وہ آوازیں بھی دیتی رہی لیکن وہاں کوئی آدم ...یکھنں تھا۔ اچانک اسے جنگل میں بکھرے ہوئے سوکھے پتوں کا شور سنائی دیا جیسے کوئی ...ھوران پتوں پر دوڑ رہا ہو۔ رفتہ رفتہ یہ آواز اس کے قریب ہوتی گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ کسی ...ھوڑے کی ٹاپیں ہیں۔ لیلیٰ کے چہرے پر خوشی اور امید کی کرن جگمگانے لگی۔ کیونکہ اس کی ...ٹی حس نے محسوس کر لیا تھا کہ گھوڑے پر کوئی سوار بھی ہے۔ یکدم درختوں کے جھنڈ سے ...ک گھوڑا سوار نظر آیا۔ جو نوجوان، صحت مند، خوبصورت اور بارعب شخص کا مالک تھا۔ لیلیٰ ...ے اسے دیکھتے ہی بچاؤ، بچاؤ کی آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ گھڑسوار پہلے ہی پریشان ...ائی دے رہا تھا۔ شاید وہ راستہ بھول کر اس جنگل میں بھٹک گیا تھا اور اس طرف آ نکلا ...ا۔ اس ویرانے میں بچاؤ بچاؤ کی آواز سن کر اور دم بخود ہو گیا۔ گھڑسوار نے اپنی تلوار کو ...ے سے باہر نکالا اور آواز کی طرف لپکا۔ وہ جنگل میں ایک عمارت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ...نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو ایک حسین و جمیل لڑکی نظر آئی۔ لیلیٰ نے اسے اپنی کہانی مختصر ...ائی۔ گھڑسوار نے بتایا کہ وہ پڑوسی ملک کے راجہ کا بیٹا ہے اور اس کا نام شہزادہ احمد ہے، وہ ...ک کر ادھر آ نکلا ہے۔ بلکہ قدرت تمہاری مدد کے لئے مجھے ادھر کھینچ لائی ہے۔ لیکن شہزادہ ...یکھ کر حیران رہ گیا کہ اس عمارت میں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ اس نے لیلیٰ سے کہا کہ وہ ...کی مدد کیسے کرے، اس کے پاس کیسے آئے؟ لیلیٰ نے کچھ دیر سوچا اور پھر اپنے لمبے بال ...ادے کر نیچے لٹکا دیئے۔ شہزادہ ان بالوں کو پکڑ کر لیلیٰ کے پاس پہنچ گیا۔ اوپر جاتے ...ے شہزادہ وہ رسی بھی اپنے ساتھ لے گیا جو شکار کھیلنے کے لئے وہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ...ادہ احمد لیلیٰ کے بالوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"شہزادے، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جادوگرنی کسی بھی وقت آ سکتی ...۔ اس لئے ہمیں جلدی یہاں سے فرار ہو کر جنگل پار کرنا ہوگا تا کہ اس کے جادو کی حدود ...باہر نکلا جا سکے"۔ شہزادہ سمجھ گیا۔ پہلے اس نے لیلیٰ کو نیچے اتارا اور پھر خود بھی رسی کی مدد

سے نیچے اتر گیا۔ وہ دونوں گھوڑے پر بیٹھ کر ہولے سے باتیں کرنے لگے۔

''اب تم کچھ بھی نہیں کر سکتی جادوگرنی لبنیٰ تمہاری پہنچ سے بہت دور جا چکا
ہے۔ میں نے تمہیں اس لئے بحث میں الجھائے رکھا تا کہ اس کو فرار ہونے کا موقع م
جائے۔ شہزادہ اپنی شہزادہ کو لے گیا ہے۔ تمہارا خواب چکنا چور ہو گیا ہے۔ اب میں تمہی
تمہارے کالے جادو کی ایسی سزا دوں گا کہ تم آئندہ کسی کو اغوا کر کے قید نہ کر سکو گی۔

یہ سنتے ہی جادوگرنی نے منہ ہی منہ میں کچھ انتر منتر پڑھا اور غائب ہو گئی۔
سمجھ رہی تھی کہ بابا کی جکڑ سے آزاد ہو چکی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ بابا اس کو مہلت د
چاہتے تھے کہ وہ جا کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ واقعی لبنیٰ اس جگہ نہیں ہے جس
اس نے اسے اپنے جادو کے زور پر قید کیا تھا اور جنگل بیابان میں ایک عمارت بنائی تھ
جس میں کوئی داخلے کا راستہ بھی نہیں تھا۔ جو بہت ہی بلند و بالا تھی۔ بس ایک کھڑکی تھی س
سے اوپر۔ جس سے نیچے دیکھا تو جا سکتا تھا لیکن اترا نہیں جا سکتا تھا۔ کوئی اگر فرار ہو
کے لئے کھڑکی میں سے نیچے چھلانگ بھی لگا دے تو اسے اس عمارت سے فرار کی راہ نہ
بلکہ زندگی سے فرار کا راستہ مل جاتا۔

جادوگرنی نے راستے میں دوڑتے دوڑتے اپنی اصلی شکل اختیار کر لی۔ اس
جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں اور ہڈیاں ہی نظر آ
تھیں۔ گوشت غائب ہو چکا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں کے ناخن بڑے بڑے
نوکیلے ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پر غیض وغضب کے آثار نظر آ رہے تھے۔ غص
حالت میں اس کے گھنگھریالے بال اکڑ کر سخت ہو گئے تھے اس کا لباس پھٹا پرانا نظر
تھا۔ شاید یہ جادوگرنی بہت زیادہ عمر رسیدہ تھی۔ جادوگرنی نے دوڑتے دوڑتے اپنے
سے ایک قینچی بنائی اور ایک پلاس تیار کیا تا کہ شہزادہ احمد جو اسے جادوئی عمارت سے
لے کر گیا ہے اسکے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن پلاس سے نوچ نوچ کر سزا دے اور

سے لبنیٰ کے خوبصورت، چمکیلے، گھنے، سنہرے اور لمبے بال کاٹ ڈالے تا کہ اس کا غصہ ٹھنڈا
ہو سکے۔ جادوگرنی نے اپنے جادو سے وہ سفید چھڑی بھی پیدا کر لی تھی جس کا ایک سرا انسانی
ٹانگ کی ہڈی کا بنا ہوا تھا اور دوسرے سرے پر انسانی کھوپڑی بنی تھی۔ اس سفید جادوئی
چھڑی سے جادوگرنی اس بلند و بالا عمارت میں اشارہ کر کے دروازہ بنا لیتی تھی اور اس میں
داخل ہو کر عمارت میں چلی جاتی تھی۔ جادوگرنی جب عمارت کے اندر داخل ہو جاتی تھی تو
وہ جادوئی دروازہ خود بخود بند ہو کر دیوار بن جاتا تھا۔

جب جادوگرنی اس عمارت کے پاس پہنچی تو اس نے عمارت کو غور سے دیکھا۔
کھڑکی پر غور کیا۔ کھڑکی کے نیچے دیوار پر کسی مرد کے جوتوں کے نشانات موجود تھے۔ جیسے
کوئی پہلے اوپر چڑھا اور پھر نیچے اترا۔ جادوگرنی فوراً سمجھ گئی کہ واقعی شہزادہ احمد لبنیٰ کو اس کی
قید سے آزاد کرا کے لے گیا ہے۔ اب تو اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی ہے۔ وہ غم
وغصے کا اظہار کرنا چاہتی تھی لیکن وہ غصہ کس پر اتارتی۔ وہاں تو کوئی آدم زاد تو کیا جانور بھی
نہیں تھا۔ اس نے سفید چھڑی سے اشارہ کیا تو عمارت کی دیوار میں ایک دروازہ بن گیا۔
جس میں وہ اندر داخل ہوئی اور یاسمین کو ڈھونڈنے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑتی پھری لیکن
اب اسے یقین ہو گیا کہ بابا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جادوگرنی فکر میں پڑ گئی کہ شہزادہ احمد کا ملک
اور سلطنت مشرق کی جانب ہے۔ اس لئے وہ اگر اپنے جادو کے زور پر ہوا میں اڑ کر مشرق
کی جانب چلی بھی تو چند منٹوں کی تگ و دو اور محنت سے وہ شہزادہ احمد اور لبنیٰ کو پکڑ لے گی۔
ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس پر کوئی علم وعمل کرنے لگا۔ یہ اثرات ویسے ہی تھے جیسا کہ
پہلے وہ خود بخود بے قابو ہو کر بابا کے پاس چلی گئی تھی اور بابا نے اسے بحث میں الجھا لیا تھا۔

جادوگرنی نے لاکھ کوشش کی لیکن وہ بابا کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ وہ منہ ہی منہ
میں اپنے انتر منتر پڑھنے لگی لیکن کسی جادو نے کوئی اثر نہیں دکھایا۔ وہ بے بس ہو کر اسی
جانب چلنے لگی جس جانب اسے بلایا جا رہا تھا۔ وہ بہت بڑی جادوگرنی تھی لیکن کلام الٰہی

میں دنیا بھر کی طاقت اور تاثیر ہوتی ہے۔ کیونکہ کلام الٰہی سچا اور موثر کلام ہے۔ اس کلام اس ذات نے لکھا ہے جو دنیا کا خالق ہے، ہر چیز کا مالک ہے۔ زمین و آسمان کو بنانے والا ہے۔ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس لئے بابا نے بھی اس کلام سے مدد لی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس مقدس اور طاقت ور، تاثیر والے کلام کے سامنے تمام جادو، انتر منتر اور کالے و سفلی علوم بے کار ہو کر رہ گئے تھے۔ بہت جلد نا چاہتے ہوئے بھی جادوگرنی دوبارہ بابا کے سامنے حاضر ہو گئی تھی۔

''کیوں دیکھ آئی اپنی آنکھوں سے! لبنٰی وہاں سے فرار ہو چکی ہے وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ چکی ہے۔۔۔'' بابا نے ایک بار پھر اپنی گفتگو کا آغاز کیا تو لبنٰی کے والدین بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ''ہاں! تم نے مجھے باتوں میں الجھائے رکھا اور وہ لوگ وہاں سے فرار ہو گئے۔ اب مجھے بھی جانے دو۔ تم نے مجھے دوبارہ یہاں کیوں بلایا ہے؟'' جادوگرنی نے نہایت بے بسی کے عالم میں بابا سے التجا کرتے ہوئے کہا۔

''کیا اپنے کئے کی سزا نہیں پائے گی۔ تجھے بغیر سزا کے جانے دوں، تا کہ تو پھر کوئی ایسا بھیانک سپنا بنے اور پھر کسی غریب اور شریف انسانوں کی بچی کو اغوا کر کے لے جائے اور جادوئی عمارت میں قید کر دے''۔

بابا نے اس کی بھیانک اور گھناؤنی حرکت اسے یاد دلائی تو وہ بولی۔ ''نہیں اب میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔ میں کسی کو اغوا نہیں کروں گی اور نہ کسی کو قید میں رکھوں گی''۔ جادوگرنی کی باتوں میں اکڑپن کی بجائے عاجزی و انکساری آ گئی تھی۔

''میں کبھی بھی جھوٹے، کافر اور جادوگروں پر اعتبار نہیں کرتا کیونکہ ان لوگوں کا کوئی ایمان نہیں ہوتا، یہ سب لوگ مفاد پرست ہوتے ہیں۔ مشکل گھڑی میں گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں اور مشکل آسان ہوتے ہی طوطا چشم بن جاتے ہیں۔ میں تمہیں تمہارے کئے کی بھرپور سزا دوں گا''۔

یہ کہتے ہوئے بابا نے لبنٰی کی والدہ سے ماچس طلب کی۔ وہ ماچس ڈھونڈنے لگی اتنے میں لبنٰی کے والد نے لائٹر بابا کے ہاتھ میں دے دیا۔ بابا نے دیکھتے ہی دیکھتے لائٹر جلایا اور اس کا شعلہ ہاتھ میں بلند کر کے ہوا میں معلق کر دیا۔ ایسا کرتا تھا کہ جادوگرنی گڑگڑانے لگی اور بابا کی منتیں کرنے لگی کہ وہ آئندہ کبھی ایسا نہیں کرے گی۔ اسے معاف کر دیا جائے۔ اس کی غلطی اور خطا کو درگزر کر کے چھوڑ دیا جائے۔ لیکن بابا نے مسلسل لائٹر جلائے رکھا۔ آہستہ آہستہ جادوگرنی کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔

اب وہ غصے کے لہجے میں بولی۔ ''بس کرو بابا، اگر تم نے مجھے اور جھلسایا تو یاد رکھو میں بھی تمہیں جلا کر راکھ کر دوں گی''۔ لیکن بابا کلام الٰہی کا ورد کرتا رہا اور اپنے حصار ہی میں بیٹھا رہا اور مسلسل ہوا میں آگ جلائے رکھی۔ جادوگرنی کی آواز اور رونے دھونے کے شور نے پورے گھر کو سر پر اٹھا لیا تھا لیکن شاید یہ آوازیں بابا اور اس کے والدین ہی سن سکتے تھے ورنہ تو پورا محلہ گھر میں چلا آتا تماشا دیکھنے کے لئے اور بابا کو اپنے عمل کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔ بابا نے جادوگرنی کی دھمکیوں کی پروا نہیں کی اور اپنے عمل کو جاری رکھا۔ رفتہ رفتہ جادوگرنی کی آواز مدھم ہوتی گئی اور آخر معدوم ہو گئی۔

بابا نے خدا کا شکر ادا کیا اور سجدہ شکر بجا لایا کہ رب العزت نے اس کو جادوگرنی سے محفوظ رکھا اور اس کے عمل کی تاثیر سے اسے کامرانی و کامیابی ملی۔ کچھ دیر کے بعد بابا حصار سے باہر نکل آیا اور اپنے سامان کو سمیٹتے ہوئے گویا ہوا۔

''بیٹا! تم لوگ بے فکر رہو۔ پڑوسی ملک کا شہزادہ احمد، لبنٰی کو اپنے ساتھ اس جادوگرنی کے جنگل سے نکال کر لے گیا ہے۔ اس کو یاسمین کے بال بے حد پسند آئے تھے اور وہ ایسی لڑکی سے ہی شادی کرنا چاہتا تھا کہ جس میں پوری دنیا کی لڑکیوں سے زیادہ کوئی منفرد بات ہو، کوئی ایسی اضافی خوبی جو سب سے ہٹ کر ہو۔ اس لئے لبنٰی کے سنہرے اور بے حد لمبے بال اس کی اضافی خوبی بنے اور اس خوبی نے اسے اسے شہزادی بنا دیا۔ اب

لیتی ساری عمر محل میں راج کرے گی اور آرام وسکون کی زندگی بسر کرے گی اور ہاں! بہت
جلد وہ آپ کے پاس آئے گی۔ اپنے شہزادے کے ساتھ۔ وہ دونوں بڑی آن بان اور
بڑی شان وشوکت سے تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے"۔ بابا یہ کہتے ہوئے
رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

بونوں کی دنیا

نعیم ایک نکھٹو لڑکا تھا۔ کاہلی اور سستی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ کو
کام نہیں کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے گھر والے اسے اٹھتے بیٹھتے برا بھلا کہتے رہتے تھے جبکہ وہ
کا کہنا تھا کہ وہ کام تلاش کرتا ہے لیکن اسے کوئی کام ملتا ہی نہیں۔ کوئی کام ملتا ہے تو مالک بہ
جلد اسے نکال دیتا ہے اور پھر وہ بے روزگار ہو جاتا ہے۔ لیکن گھر والے اچھی طرح نعیم
جانتے تھے۔ وہ نہ صرف نکھٹو، کاہل اور سست تھا بلکہ پرلے درجے کا جھوٹا لڑکا تھا۔ وہ بار
بات پر جھوٹ بولتا تھا اور یہ بات سمجھتا تھا کہ جھوٹ بول کر اس کی جان بچ گئی اور اس کو مار نہیں
پڑی۔

ایک روز اس کے ابو نے اسے سدھارنے کے لئے ڈانٹ پلائی کہ اگر وہ کا
پر نہ گیا یا محنت مزدوری سے جان چرائی تو وہ اسے گھر سے نکال دیں گے۔ نعیم سارا د
دوستوں کے ساتھ کھیلتا رہا اور شام کے وقت گھر آتے ہوئے سوچنے لگا کہ وہ ابو سے کہہ دے
کہ اس نے دن بھر ایک دکان پر کام کیا تھا لیکن شام کو مالک نے خالی ہاتھ لوٹاتے ہوئے ا
سے کہا کہ وہ کل سے کام پر نہ آئے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس بار اس کا جھوٹ بولنا سود مند نہیں
ہوگا۔ نعیم مار کے ڈر سے گھر آنے کی بجائے گھر سے دور ہوتا چلا گیا رات اس نے ایک

میں بسر کی۔ صبح ہوتے ہی وہ آوارہ گردی کرنے لگا۔ وہ چلتے چلتے شہر سے دور نکل گیا اب اسے
بھوک نے ستایا تو وہ کھانے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا۔

دور ایک سیب بیچنے والے کی ریڑھی نظر آئی لیکن اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ
رفتہ رفتہ ریڑھی کے پاس گیا۔ ریڑھی والا کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔ نعیم نے دو تین
سیب چپکے سے اٹھائے تھے کہ اس نے ریڑھی والے کو اپنی طرف تیز تیز قدموں سے آتے
دیکھا۔ نعیم پکڑے جانے کے ڈر سے دوڑنے لگا۔ ریڑھی والا بھی اسے کے پیچھے بھاگنے لگا۔
کچھ اور لوگ بھی نعیم کو پکڑنے کے لئے دوڑے لیکن وہ بہت پھرتیلا تھا کسی کے ہاتھ نہ آیا۔
لوگوں نے اسے ہاتھ سے نکلتے دیکھا تو بھاگنے سے باز آئے لیکن چور چور کی صدائیں اس کا
پیچھا کرتی رہیں۔

پکڑو اسے پکڑو، پولیس کے حوالے کرو۔ اس قسم کی آوازیں اس کا دور تک
پیچھا کرتی رہیں لیکن وہ بے تحاشہ دوڑتا رہا۔ جب اس کے قدم رکے تو اس نے اپنے آپ کو
ایک پتھریلے علاقے میں پایا۔ جہاں دور دور تک چٹیل میدان تھا۔ بڑے بڑے پہاڑ اور غار
تھے نعیم کو کچھ اور نہ سوجھا تو وہ ایک غار میں چلا گیا۔

غار کے اندر جانے کے بعد اس نے خود کو محفوظ کر لیا۔ پہلے تو نعیم نے اپنی سانسیں
درست کیں۔ سکون کا سانس لیا اور پھر پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے چوری کئے ہوئے سیب
کھانے لگا۔ ابھی وہ سیب کھا کر فارغ ہی ہوا تھا کہ اسے غار کے دہانے پر کسی کے قدموں کی
چاپ سنائی دی۔ وہ پکڑے جانے کے ڈر سے غار کے اور اندر جاتا گیا۔ اندھیرا بڑھتا جارہا تھا
وہ جتنا غار کے اندر جارہا تھا۔ پولیس کا خوف اور پٹائی کا ڈر اسے اندھیرے میں بھی چلنے
پر مجبور کر رہا تھا۔

یکدم اس کا پاؤں پھسل گیا اور ایک بڑے سے گڑھے میں گرتا چلا گیا۔ شاید یہ
گڑھا نہیں، کوئی کنواں تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ جب وہ اس گڑھے کی تہہ میں گرا تو ریت پر گرا

ورنہ پتھر ہوتے تو اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی ۔ نعیم بہت حیران ہوا کہ غار کے اندر اتنا بڑا گڑھا کیسے بنا اور پریشان ہوا کہ اس گڑھے سے باہر کیسے نکلے گا۔ لیکن اس کی نظر دائیں ہاتھ کی جانب پڑی تو وہ مزید حیران ہوا۔ کیونکہ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس جگہ سے کوئی راستہ آگے کی طرف جا رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھا اور اس جانب قدم بڑھانے لگا۔ واقعی ایک راستہ جو گڑھے کے اندر سطح ہموار کیے ہوئے تھا لیکن نعیم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اگر یہ راستہ ہے تو اتنا چھوٹا سا کیوں ہے اور یہ راستہ کہاں جاتا ہے۔

تجسس نے اس کے قدموں کو اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک ایک قدم ناپ تول کر اٹھا رہا تھا۔ ذرا آگے گیا تو اسے ایک سوراخ نظر آیا۔ سوراخ اتنا بڑا ضرور تھا کہ اس میں سے اندر داخل ہوا جا سکتا تھا۔ نعیم سمجھا کہ یہ کوئی روشن دان ہے یا کوئی کھڑکی ہے۔ نعیم نے اس روشن دان سے اندر جھانکا تو اس پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اندر تو کوئی شہر آباد تھا۔ ایک بستی نما جگہ تھی۔ گھر تھے، دکانیں تھیں، سڑکیں تھیں اور کاروبار زندگی معمول کے مطابق چلتا دکھائی دے رہا تھا۔ نعیم کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی فلم، ٹیلی ویژن پر دیکھ رہا ہو۔ اس کو باری باری ہر چیز نظر آ رہی تھی۔

جس بات نے اس کی سب سے زیادہ توجہ اس کی طرف کرائی وہ اس بستی کی چیزیں تھیں۔ مکانات چھوٹے چھوٹے۔ جیسے لوگ سمندر کے ساحل پر سمندر کی گیلی ریت سے گھروندے بناتے ہیں۔ دکانیں بھی چھوٹی تھیں۔ جیسے کارٹونوں کے گھر ہوں۔ سڑکیں بہت ہی باریک اور کم چوڑی تھیں ایسے جیسے ہمارے بڑے بڑے گھروں میں راہ داریاں ہوتی ہیں۔ وہ حیرانی سے اسی روشن دان کے ذریعے اندر اتر گیا۔ ذرا سا آگے بڑھا تھا کہ اسے دو گڈے چلتے نظر آئے جیسے چابی والے کھلونے ہوتے ہیں۔ وہ چلتے جا رہے تھے۔ رکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ نعیم سوچنے لگا کہ یہ کون سی چابی والے گڈے ہیں جس کی چابی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ جب اسے سامنے سے ایک گڑیا آتی نظر آئی تو وہ اس کے راستے میں

بیٹھ گیا۔

جیسے ہی وہ قریب آئی، نعیم نے اسے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن وہ ایسے اچھلا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ کیونکہ اس گڑیا نے اس سے خوف زدہ ہو کر چیخ مار دی۔ تب نعیم کی موٹی عقل میں بہت دیر کے بعد آیا کہ یہ کوئی گڈے اور گڑیا نہیں بلکہ بونے لوگ ہیں۔ جن کو لوگ بالشتی بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ تو کہانیوں کا کردار ہوتے تھے، ان کا وجود تو ممکن نہیں تھا۔ پھر یہ میرے سامنے سچ مچ کیسے آ گئے ہیں۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے اپنے دانتوں میں شہادت کی انگلی کو دبایا تو تکلیف کا احساس ہوا تب اسے یقین ہو گیا کہ وہ خواب میں نہیں بلکہ حقیقت میں دیکھ رہا ہے کہ وہ بونوں کی دنیا میں پہنچ چکا ہے اور اس وقت وہ بونوں کی ایک بستی میں کھڑا ہے۔ نعیم کو ان دیکھی دنیا بہت بھلی لگی۔

وہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا کہ ان بونوں کی دنیا کیسی ہوتی ہے۔ ان کے رہن سہن کے طور طریقے کیا ہیں۔ ان کی تہذیب و ثقافت کیا ہے؟ ان کے ملبوسات کیسے ہیں۔ یہ لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیا کھاتے پیتے ہیں؟ ان کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ ان کی پیدائش اور موت کی رسومات کیا ہیں؟ یہ کس طرح مل جل کر رہتے ہیں۔

نعیم خاموشی سے ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے چھپ کر یہ تمام منظر دیکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے کئی بار ماموں جان سے بونوں کی کہانی سنی تھی۔ وہ تو آج تک یہی سمجھتا تھا کہ بونوں کا کردار فرضی ہے۔ بھلا اس قدر چھوٹے چھوٹے انسان کیسے ہو سکتے ہیں لیکن ماموں جان کے کہانی سنانے کا انداز بھی بڑا غضب کا ہوتا تھا۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کہانی نہیں بلکہ آنکھوں دیکھا حال سنا رہے ہوں۔ نعیم کو یاد تھا کہ ایک بار ماموں جان نے بتایا تھا کہ ان کے گاؤں میں کنواں کھودا گیا تھا۔ کیونکہ ان کے گاؤں میں پانی کی بہت قلت تھی۔ اس لئے چودھری صاحب کی مدد سے گاؤں والوں نے ایک کنواں انتھک محنت اور رات دن کی جستجو سے کھود لیا تھا۔ اس کنویں سے پانی بھی نکلنے لگا تھا جو بہت میٹھا تھا۔

کنواں کھود لینے کے بعد جب آخری آدمی کنویں کی تہہ سے اوپر آنے لگا تھا تو ایک بونے پر اس کی نظر پڑی، وہ سمجھا کوئی جانور ہے لیکن غور سے دیکھنے کے بعد پتا چلا کہ وہ کوئی جانور نہیں بلکہ بالشتی انسان ہے۔ ایک بونا ہے جو نجانے کہاں سے اس کنویں میں آ گیا ہے۔ وہ بڑی احتیاط اور کمال ہوشیاری سے اسے اوپر لے آیا اور اپنے تمام ساتھیوں کو بات بتا کر بونے کو دکھایا لیکن جیسے ہی اس شخص نے کنویں سے باہر اس بونے کو نکالا وہ مر گیا۔ کہتے ہیں کہ بونوں کی زندگی کے آثار زمین کی نچلی سطح تک ہی ہوتے ہیں۔ زمین کے اوپر کی آب وہوا میں ان کا دم نکل جاتا ہے۔

گاؤں کے لوگ دور دور سے اس بونے کو دیکھنے کے لئے آئے جو کنویں سے باہر آتے ہی مر گیا تھا۔ یہ سچا واقعہ کہہ کر ماموں نے سنایا تھا تب نعیم کو بڑی حیرت ہوئی تھی کہ بونوں کا کردار ہی نہیں ہے بلکہ وہ بذات خود زندہ ہوتے ہیں۔ انسانوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں۔ سوتے جاگتے ہیں۔ زندگی کی دیگر ضروریات پوری کرتے ہیں اور ان کے ہاں موت اور پیدائش بھی ہوتی ہے۔ ان کی دنیا الگ ہوتی ہے۔ نعیم کو ماموں کی تمام باتیں اور کہانیاں ایک ایک کرکے یاد آنے لگیں۔ ماموں نے ایک کہانی میں بتایا تھا کہ بونے افراد کے ہاں جب کوئی مر جاتا ہے تو وہ اسے نہلاتے ہیں۔ صاف ستھرا کرکے کفن پہناتے ہیں اور پھر بالکل ہماری طرح قبر میں دفنا دیتے ہیں۔ چند بونے اس کی نماز جنازہ بھی ادا کرتے ہیں لیکن فرداً فرداً۔ نعیم کو وہ کہانی بھی اچھی طرح یاد آ گئی تھی جس میں ماموں نے بتایا تھا کہ ان کے یہاں شادی کی رسومات بھی ہوتی ہیں۔ لڑکے اور لڑکی کو سامنے بٹھا کر پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم اس لڑکے کے ساتھ رہنا پسند کرو گی؟ اگر لڑکی ہاں کہہ دے تو پھر لڑکے سے پوچھا جاتا ہے۔ کیا تم اس لڑکی کی حفاظت اور زندگی بھر ساتھ رہنے کا ذمہ لیتے ہو؟ ہاں کہہ دینے کی صورت میں ان کو دعائیں دے کر رخصت کر دیا جاتا ہے، تب وہ اپنا الگ گھر بساتے ہیں اور ساتھ ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔

نعیم بہت حیران ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی تھا۔ وہ بونوں کی حقیقت میں چلتا پھرتا دیکھ رہا تھا۔ کوئی کاروبار میں مصروف تھا تو کوئی گھر بار کے کام کاج کرنے میں۔ عورتیں بھی گھریلو کام کاج میں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی سلائی کڑھائی کا کام کر رہی تھی تو کوئی چولہا جلا کر روٹی سالن تیار کرنے میں مگن تھی۔ نعیم کو بونوں کی زندگی نے تو حیران کر رکھا تھا لیکن جس بات نے سب سے زیادہ حیرت میں ڈالا تھا وہ تھی بونوں کی آمدورفت۔ یعنی ان کی آمدورفت کے ذرائع جن کے ذریعے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے ہوں گے۔

فی الحال تو نعیم کی نظر ایک بیل گاڑی پر پڑی۔ جس کو ایک بونا چلا رہا تھا لیکن مزید حیرانی کی وجہ تھا کہ نہ صرف بیل گاڑی چھوٹی سی تھی بلکہ اس بیل گاڑی میں جوتا گیا بیل بھی بونا تھا۔ ذرا فاصلے پر اس کی نظر پڑی تو ایک بکری دیکھی تو وہ سمجھا کہ بکری کا بچہ ہے لیکن غور کرنے پر یہ عقدہ اس پر کھلا کہ وہ بونے آدمیوں کی گائے ہے۔ جس کا دودھ ان کی خوراک بنتا ہے۔ کافی مناظر دیکھتے دیکھتے شام کا وقت ہو چلا تھا۔ نعیم نے محسوس کیا کہ سب بونے مغرب کی طرف جا رہے ہیں۔

یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی جبکہ گھر تو مشرق، شمال اور جنوب کی طرف بھی واقع تھے۔ یہاں تک کے بونے شام ہونے پر دکانیں بند کرکے مغرب کی جانب چل پڑے۔ مغرب کی طرف سفر کرنے والوں میں نہ صرف مرد، عورتیں اور بوڑھے شامل تھے بلکہ نوجوان اور بچے بھی خوش و خرم اسی طرف چلے جا رہے تھے۔ جب سڑک سنسان ہو گئی تو نعیم نے بھی چند قدم آگے بڑھائے۔ اسے بہت دور ایک میدان نظر آیا۔ اس میدان میں بہت سارے کھلونے بکھرے پڑے تھے۔ پھر یکدم اسے خیال آیا کہ یہ کھلونے نہیں ہیں بلکہ وہی بونے ہیں جو اس بستی میں رہتے ہیں اور سب اس میدان میں آ کر جمع ہو گئے ہیں۔

نعیم بھی اس میدان کی طرف چل دیا۔ یہ دیکھتا ہے کہ میدان میں عید کا سا سماں ہے۔ ہر بونا خوش دکھائی دیتا ہے۔ سب نے اچھے اچھے لباس پہنے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ

میدان کے اطراف میں واقعی اپنے گھروں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر میلہ دیکھ رہے تھے اور کچھ لوگ بیل گاڑیوں میں بیٹھے تھے۔ اس میلے میں خیمے بھی نصب کئے گئے تھے اور دکانیں بھی لگائی گئی تھیں۔ ہنر مند بونے اپنے ہنر کا شاہکار تیر، کمان، تلواریں، نیزے اور ڈنڈے، لاٹھیاں اور دیگر اوزار بنا کر لائے تھے۔ اس میلے میں یہ تمام چیزیں فروخت کے لئے لائی گئی تھیں۔ اس وقت خرید و فروخت کا بازار گرم تھا۔ نعیم کو بہت اچھا لگ رہا تھا کہ وہ عمر بھر ان لوگوں کی زندگی بسر ہوتے دیکھتا رہے۔

نعیم نے دیکھا کہ ان لوگوں میں پیار، محبت اور اتحاد بہت تھا۔ وہ ایک دوسرے سے اخلاق سے بول رہے تھے۔ انتہائی ملنسار تھے۔ محبت کے بھوکے۔ کسی میں بھی لڑائی جھگڑے کی خو نہیں تھی۔ نفرت کا نشان بھی ان کے دلوں میں نہیں تھا۔ چوری، جھوٹ، غیبت، بہتان، الزام تراشی اور مکر و فریب سے وہ لوگ بالکل عاری تھے۔ کاروبار میں بھی انتہائی ایمان داری اور پوری ناپ تول سے کام لے رہے تھے۔ ہر شخص محنت سے کام کر رہا تھا۔ اپنی دھن میں مگن اور لگن کا پکا دکھائی دیتا تھا۔ نعیم کو ان بونے انسانوں کی زندگی کے یہ پہلو بہت پسند آئے اس کا دل کڑھنے لگا کہ ایک بالشت کے انسان کس قدر مخلص اور پاک باز ہیں جبکہ چھ چھ اور پانچ پانچ فٹ کے انسان کس قدر دھوکے باز، لٹیرے، قاتل، سود خور، جھگڑالو، بے ایمان، چغل خور اور بدزبان ہیں۔ نعیم اپنی زندگی سے بے زار نظر آنے لگا۔ اس نے دل میں دعا کی، یا اللہ تو مجھے بھی بونا ہی بنا دیتا تا کہ ان کے ساتھ اچھی زندگی گزارتا۔ تا کہ خطروں اور گناہوں سے پر زندگی سے بچ جاتا۔ بہر حال اب ایسا ممکن نہیں تھا۔

نعیم کے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا کہ جب اس کی نظر ایک بونے مداری پر پڑی جو ایک عجیب سی شکل والے بونے کے پیٹ پر رسی باندھ کر کرتب دکھا رہا تھا۔ اس کی حرکتوں پر سب کو ہنسی بھی آ رہی تھی اور حیرت بھی ہو رہی تھی۔ میلہ دیکھنے آنے والے سبھی بونے اس مداری کے گرد جمع ہونے لگے اور اس کے ہاتھ میں رسی میں بندھے بونے کے کرتب

دیکھنے لگے۔ یہ شاید مداری کا بچہ جمہورا تھا۔ جو انتہائی ہلکی پھلکی حرکتوں اور چہرے کے ساتھ ساتھ جسم کی جنبش سے بھی مزاح پیدا کر رہا تھا۔ نعیم کا دل بھی اس کی حرکتوں سے بہل رہا تھا۔ مداری نے بچہ جمہورا کو حکم دیا کہ وہ ناچ دکھائے۔ چنانچہ بچہ جمہورا ناچنے لگا۔ اب تو اور بھی مزہ آنے لگا۔ وہ تنکے کی طرح اِدھر اُدھر لڑکھڑانے لگا۔ اس کے جسم میں ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔ گوشت کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے جسم میں لچک زیادہ تھی جس کی وجہ سے اسے جسم کو تھرتھرانے میں آسانی پیدا ہو رہی تھی۔ شاید وہ اپنے اسٹائل میں ڈسکو ڈانس کر رہا تھا۔

ابھی میلہ جاری تھا اور سب اپنے اپنے کاروبار اور کھیل کود میں مصروف تھے کہ نعیم کی نظر ایک چھوٹے سے بچے پر پڑی جو بیل گاڑی پر بیٹھا مداری اور اس کے بچے جمہورے کا تماشا دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ نعیم کو وہ بچہ بے حد پیارا لگا۔ اس کے دل میں بچوں کا پیار جاگ اٹھا۔ واقعی نعیم کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ وہ اکثر گلی میں محلے کے بچوں کو جمع کر لیتا اور ان کو کھیل کھلاتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی جیب خرچ سے چیزیں خرید کر بچوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ وہ کھیل کے دوران بھی بچوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اپنے حصے کے پیسے خرچ کر دیتا تھا۔ کسی بچے کی کوئی حرکت پسند آ جاتی تھی تو نعیم اسے مٹھائی دلا دیتا تھا۔ کوئی بچہ اس کی بات مان لیتا تھا تو بھی وہ اسے انعام کے طور پر ایک یا دو روپے دیتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اتنا ننھا منا سا ایک انگلی کے برابر بچہ دیکھ کر نعیم سے رہا نہ گیا وہ دبے پاؤں چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اسے آہستگی سے پکڑ کر ہتھیلی پر بٹھا لیا۔ ہتھیلی کو بلند کر کے نعیم اس بچے کو آنکھوں کے سامنے لے آیا۔ نعیم کے چہرے کے تاثرات دیکھنے والے تھے۔ شاید اتنی زیادہ خوشی اس کے چہرے سے اس سے پہلے عیاں نہیں ہوئی تھی۔ وہ فرط جذبات میں سب کچھ بھول گیا تھا کہ وہ اس وقت بونوں کی دنیا میں موجود ہے اور ایک میلے میں کھڑا ہے۔ وہ بھول گیا تھا کہ بچہ ہتھیلی پر لینے سے اس کے خلاف کوئی ردعمل بھی ہو سکتا ہے۔ اچانک

اس کو اپنے پیروں کے اوپر دکھن کا احساس ہوا۔ اس نے پاؤں پر نظر ڈالی تو سکتے میں رہ گیا۔ تمام بونے اس کے گرد جمع ہو گئے ہیں اور اس بونے بچے کی ماں نعیم کو غضب ناک نظروں سے گھور رہی ہے۔ چند بونے مل کر اس کے پاؤں پر ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے مار رہے ہیں۔ تب اسے خیال آیا کہ میں نے بچے کو پیار کرنے کے لئے اٹھایا تھا شاید یہ لوگ سمجھے کہ میں اسے اغوا کر کے لے جانا چاہتا ہوں۔ نعیم نے فوراً بچے کو دو انگلیوں سے پکڑ زمین پر چھوڑ دیا۔ بچے سے جس قدر تیز بھاگا جا سکتا تھا وہ بھاگا اور اپنی ماں سے جا کر لپٹ گیا جو ابھی تک غصے سے نعیم کو گھور رہی تھی۔ وہ لوگ آپس میں صلاح کرنے لگے۔ اس سے پہلے ان میں نعیم کے خلاف کوئی سازش تیار ہوتی یا کوئی بدگمانی پیدا ہوتی وہ وہاں سے کھسک لیا۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن با دل نخواستہ اسے وہاں سے بونوں کی حفاظت کے ڈر سے واپس آنا پڑا۔

نعیم واپسی پر خراماں خراماں چلا رہا تھا تا کہ مزید کچھ دور تک وہ بونوں کی دنیا کی عجیب و غریب باتوں کو نوٹ کر سکے۔ اس نے وہاں پر چند درخت دیکھے جو شکل و صورت میں تو درختوں ہی کی طرح تھے۔ شجر کی طرح ان کے تنے بھی تھے۔ شاخیں لچک دار تھیں جن پر پھل پھول بھی لگے ہوئے تھے۔ کچھ درختوں کی شاخوں پر ثمر بھی آ رہا تھا۔ سرسبز و شاداب گھاس کے پلاٹ بھی تھے۔ شاخوں پر ہرے بھرے رنگ کے دیدہ زیب پتے بہت خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ یوں تو درخت بھی ہریالے نظر آ رہے تھے لیکن وہی حیرت کی بات کہ بونوں کی دنیا میں ان کے قد کی طرح ان کی ہر شے چھوٹی تھی۔

جس گڑھے میں گر کر اسے بونوں کی دنیا کا راستہ ملا تھا۔ وہ اس گڑھے کے دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہی روشن دان جس سے وہ اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے غور کیا تو پتہ چلا کہ یہ کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں ہے بلکہ بونوں کی بستی میں جانے کے لئے مین گیٹ ہے۔ نعیم ان کی بستی کے مین گیٹ تک پہنچ ہی پایا تھا کہ اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اس نے سوچا کہ میں نے ان بونوں کی زندگی اور رہن سہن کے طور طریقے

دیکھ لئے ہیں۔ ان کی تہذیب و ثقافت تو جان لی ہے۔ ان کی آواز کس قدر بلند ہوتی ہے۔ ہ کا لہجہ پست و دھیما ہوتا ہے یا پھر تیز و تلخ۔

یہ خیال آیا تو اس کو احساس محرومی ہونے لگا۔ دراصل بات یہی تھی کہ وہ ابھی تک ی بونے کے قریب نہیں ہو پایا تھا۔ کسی سے اس کی دوستی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ تو دور دور ے انہیں چھپ چھپ کر دیکھتا رہا تھا۔ پھر بھلا اسے ان کی آواز کا پتہ کیسے چلتا۔

ہاں نعیم کو کچھ کچھ یاد آیا کہ جب اس نے بونے بچے کو اٹھا کر ہتھیلی پر رکھا تھا تب وہ چیخ چیخ کر زار و قطار رو رہا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے کے تاثرات اور منہ کھولنے کا انداز بتا تھا کہ بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنے قریب ہونے کے باوجود ہ کو بچے کے رونے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کیا ان بونوں کے قد چھوٹے ہونے کے ساتھ ھ ان کی آوازیں بھی مدھم ہوتی ہیں۔ یہ سوچتے ہی نعیم کا تجسس اور بڑھ چلا۔ اب تو اس ، فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ان کی آوازیں سن کر ہی واپس جائے گا اور اگر ان کی گفتگو اور زبان یا اس کی سمجھ میں آئی تو ان بونوں سے دوستی کر کے چند دن ان کا مہمان رہے گا۔ نعیم اس ن میں تھا کہ اسے قریب ہی دو بونے نظر آئے۔ وہ ان کے قریب بیٹھ گیا تو اپنی سماعت کی ان کی جانب ہوئی لیکن وہ دونوں باتیں تو کر رہے تھے لیکن نعیم تک ان کی آواز پہنچ نہیں تھی۔

اس نے بہت توجہ سے سنا لیکن آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ان منہ سے شاید آواز نہ نکلتی ہو۔ فقط ان کے ہونٹ ہلتے ہوں اور یہ لوگ آپس میں ہونٹوں اشاروں سے ایک دوسرے کی گفتگو لیتے ہوں یا یوں کہنا چاہیے کہ سمجھ لیتے ہوں۔ نعیم س ابھی بھی قائم تھا۔ اس نے کوئی شرم محسوس نہ کی اور وہ زمین پر اس انداز سے لیٹ گیا جہ ان کا ان بونوں کے نزدیک ہو گیا۔ اب اس نے انتہائی توجہ سے ان کی آواز سننے کی ش کی۔ نعیم زمین پر لیٹا ایک مسخرہ لگ رہا تھا لیکن اسے شرم و حیا اس لئے بھی نہیں آ رہی تھی

کہ اسے دیکھنے والا یا شرمندہ کرنے والا وہاں پر کوئی دوسرا انسان نہیں تھا۔

"بھئی یہ کیا بلا ہے؟" ایک بونے نے دوسرے بونے کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا۔

یقیناً یہ بونے ہی کی آواز تھی جو بمشکل نعیم کے کان سے ٹکرائی تھی۔ اس نے شکر ادا کیا کہ اسے اتنا تو پتہ چل گیا کہ بونے بھی اردو بولتے ہیں لیکن ان کی اردو اتنی اعلیٰ نہیں تھی۔ بس عام سی بولی تھی۔ جسے لشکری زبان کہہ سکتے ہیں۔ جس میں بہت سی زبانوں کے الفاظ بھی ملے ہوتے ہیں۔

"بھئی جس طرح جن، بھوت، حیوان، چڑیل، پری، جانور اور پرندے د چرندے ہوتے ہیں اسی طرح دیوہیکل جسامت رکھنے والوں میں انسان بھی ہوتے ہیں۔ جنہیں آدم زاد کہا جاتا ہے۔ یہ ہماری جان کے دشمن ہوتے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھا لے جاتے ہیں اور اپنی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ ان کی دنیا شاید خلا میں واقع ہے۔ جہاں پر جاتے ہی ہمیں سانس لینے میں بہت دقت پیش آتی ہے اور وہاں کی آب و ہوا میں ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے اور چند ساعتوں ہی میں ہمارا دم نکل جاتا ہے اور ہم مر جاتے ہیں۔

دوسرے بونے نے آدم زاد کے متعلق تفصیل سے بتاتے ہوئے اسے سمجھایا۔

باتیں سن کر اس کے چہرے پر خوف کی لہریں آنے جانے لگیں۔

"کیا کہا! یہ لوگ ہمیں دیکھتے ہی اغوا کر کے اپنی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ جہاں ہم چند ساعتوں ہی میں مر جاتے ہیں؟" دوسرے بونے نے حیرت سے اس کی باتیں دہرائیں۔

"ہاں! تم نے دیکھا نہیں کہ اس آدم زاد نے ہمارے بچے کو اٹھا کر اغوا کر لیا تھا۔ ہم اس پر اس زور کا حملہ نہ کرتے تو یہ اسے اپنی دنیا میں اغوا کر کے لے جاتا اور اسے مار دیتا۔ اللہ ہمیں ان آدم زادوں کے شر سے بچائے"۔ ایک بونے نے دعائیہ انداز میں جملے ک

ہوئے نعیم کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور دوسرے بونے نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آمین کہا۔

اب نعیم سے اس جگہ رکنا ممکن نہیں رہا۔ وہ ایک الوداعی نظر ڈال کر بونوں اور ان کی دنیا کو خدا حافظ کہہ کر اس روشن دان سے باہر نکل آیا۔ بہ مشکل وہ گڑھے سے اوپر غار تک پہنچا اور اندھیرے میں چلتا ہوا غار سے باہر نکل گیا۔ اب اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچا اور اس نے اپنے غائب رہنے کی وجہ سب کو بتائی۔ اس نے بونوں کی زندگی اور ان کی بستی کی ایک ایک بات تفصیل سے بتائی لیکن کسی ایک شخص نے یا کسی چھوٹے سے بچے نے بھی اس کی باتوں پر یقین کرنے سے انکار کر دیا اور ان باتوں کو فقط ایک کہانی قرار دیا جو اس نے اپنے من سے گھڑ کر سنائی ہے یا کسی نے اسے خواب سے تعبیر کیا کہ نعیم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔

اس بار نعیم نے جی بھر کر قسمیں کھائیں کہ خدا کی قسم اس نے جو کچھ بتایا ہے یہ سب وہ اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہے لیکن نعیم اس قدر جھوٹ بولتا تھا کہ اس کی سچی باتوں کو بھی جھوٹ جانا گیا اور اس کا مذاق اڑایا گیا۔ تب اسے کم از کم یہ نصیحت ہوگئی کہ انسان کو مذاق میں بھی جھوٹ سے کام نہیں لینا چاہیے۔

☆☆☆

شیخ چلی کا بچہ

حنیف سکول تو چلا جاتا تھا۔ لیکن اس کا مقصد پڑھائی نہیں ہوتا تھا وہ تو بچوں کو اپنے کلاس فیلوز کو وہ خواب سنانے جاتا تھا جو اس نے رات کو دیکھا ہوتا تھا۔ اس کے کلاس فیلوز بھی اس کی ہر ہر بات سے دلچسپ ہوتے تھے کیونکہ نہ صرف اس کی باتیں مزاحیہ ہوتی تھیں بلکہ وہ خواب سنانے کی اداکاری بھی اچھی کر لیتا تھا۔ ان باتوں میں وہ بہت دلچسپی رکھتا

تھا۔ کئی بار اساتذہ سے اچھی خاصی پٹائی کھانے کے باوجود وہ کہانی۔ لطیفے اور اکثر اپنے خواب سنانے سے باز نہیں آتا تھا۔ آج بھی وہ بہت بے چین تھا کیونکہ اس نے بڑا عجیب و غریب خواب دیکھا تھا جسے وہ بچوں کو سنانے کے لئے بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ موقع ملتے ہی وہ بچوں کو لے بیٹھا اور کہنے لگا۔ ''دوستو! آج میں نے جو خواب دیکھا ہے ایسا خواب اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں بے چین ہوں کہ جلد از جلد تمہیں بتاؤں کہ میں نے آج کون سا خواب دیکھا ہے''۔ اس نے تجسس اور دلچسپی پیدا کرتے ہوئے بچوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

''لیکن حنیف بھائی آج تو آپ صبح سویرے اٹھے ہوں گے، ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کیا ہوگا اور پھر بستہ اٹھا کر اسکول آگئے ہوں گے، پھر تم کب اور کیسے اور کہاں سو گئے کہ جو تم نے آج خواب دیکھ لیا''۔ ایک شرارتی بچے نے اس کے الفاظ پکڑتے ہوئے طنز کیا۔

''چنو تجھے طنز کرنے کی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔ میں نے اگر آج کا لفظ استعمال کر لیا تو کیا ہوا۔ اس سے مراد ہے کل رات والا خواب۔۔۔'' حنیف کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ وہ ناراض ہو کر بولا۔ ''جاؤ! میں تمہیں نہیں بتاؤں گا کہ کل رات میں اڑن اونٹ پر سوار ہو کر راج محل گیا تھا اور میں نے وہاں کیا کیا کھایا اور شہزادی سے کیا کیا باتیں کیں''۔ اس بار اس نے ناراضگی کا اظہار آدھا خواب بتا کر کیا تھا۔ ''حنیف بھائی آپ تو ناراض ہوگئے۔ یہ چنو تو ایسے ہی بک بک کرتا رہتا ہے۔ چلو اس کی طرف سے میں سوری کہہ دیتا ہوں لیکن تم ہمیں یہ پورا خواب سنانا۔ کیوں کہ ہم نے اڑن کھٹولے کا نام تو سنا ہے یا اڑن گھوڑا تو تصویروں میں دیکھا ہے لیکن اڑن اونٹ پہلی بار سن رہے ہیں''۔ بلو نے اس کی خوش آمد کی تو وہ مان گیا۔ مانتا کیسے نہ، اسے تو خود بے چینی پیدا ہو رہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح دماغ کو ہلکا کرلوں۔ وہ ناراضگی دور کر کے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''ہاں تو بچو! سنو!'' حنیف نے کہانی یا خواب سنانا اس طرح شروع کیا۔

''کل رات میں رانا صاحب کے اونٹ کو کھانا کھلا کر سویا تھا۔ ابھی میری نیند پکی بھی نہ ہوئی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو ایک باغیچے میں پایا۔ میں اس باغیچے میں بالکل تنہا تھا۔ مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ آج رات جو شخص راج محل کی چھت پر اترے گا وہی ایک شہزادی سے شادی کرے گا۔ میں یہ سمجھا کہ یہ میرا وہم ہے۔ میں نے توجہ نہیں دی۔ کچھ دیر بعد پھر وہی آواز آئی تو میں نے غور سے سنا۔ وہی آواز تھی اور وہی چیلنج تھا کہ جو شخص آج رات راج محل کی چھت پر اترے گا وہ شہزادی سے شادی کرے گا۔ جب تیسری بار اعلان ہوا تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ میری سماعت کا وہم نہیں ہے بلکہ کوئی میرے دماغ میں یہ بات منتقل کر رہا ہے تا کہ میں راج محل تک پہنچوں اور اس کی چھت پر اتروں تا کہ میری شادی شہزادی سے کردی جائے۔ شہزادی کا نام سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ کیونکہ میں نے سنا تھا کہ راج محل میں جب کھانا چنا جاتا ہے تو ایک میز پر ستر قسم کے کھانے رکھے جاتے ہیں۔ جس کو جو دل چاہے کھائے اور جتنا جی چاہے کھائے اور ٹھنڈے ٹھنڈے مشروب پیئے۔ کھانے اور پینے کی چیزوں کا خیال آتے ہی میرے منہ میں نہ صرف پانی بھر آیا بلکہ مجھے شوق ہوا کہ شاہی زندگی گزاروں۔ ہر طرف خدام کی قطاریں لگی ہوں۔ کنیزیں میرے ناز اٹھانے کے لئے میرے پاس کھڑی ہوں۔ میں ان سب کو اپنے پاس جمع کر کے اپنا خواب سناؤں''۔ بچوں کے منہ سے بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی کہ حنیف میاں راج محل میں شہزادے کا روپ دھارنے کے باوجود بھی کنیزوں سے خدمات لینے کی بجائے ان کو خواب سنانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ بچوں کی ہنسی پر اس نے توجہ دی تو اسے احساس ہوا۔ لیکن اس نے اپنی بات کو جاری رکھا۔

''ہاں تو میں باغیچے میں کھڑا اس آواز کی سمت کا تعین کر چکا تھا۔ لیکن راج محل کی چھت پر اترنے کا مطلب تھا۔ کسی اڑن طشتری میں بیٹھا جائے یا اڑن کھٹولا منگوایا جائے یا پھر اڑن گھوڑا حاصل کیا جائے جس پر بیٹھ کر راج محل کی چھت پر اترا جا سکتا تھا اور شہزادی سے شادی کی جا سکتی تھی۔ ابھی میں افسوس کر ہی رہا تھا کہ مجھے قریب آنے پر میں نے اسے پہچان

لیا۔ وہ راناجی کا وہی اونٹ تھا جسے میں کھانا کھلا کر سویا تھا۔ اونٹ ایک جانور تھا۔ احسان یاد رکھنے والا۔ وہ انسانوں کی طرح احسان فراموش نہیں تھا۔ اونٹ نے آتے ہی میرے پاؤں چھوئے اور کہا۔ "حنیف صاحب! آپ نے کل رات مجھ بھوکے کو کھانا کھلا کر احسان کیا تھا۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ آج آپ کے احسان کا بدلہ احسان سے دوں گا۔ میں آپ کو راج محل کی چھت پر لے کر چلوں گا"۔ اونٹ کی باتیں میرے دل پر اثر انداز ہوئی تھیں۔ لیکن میں نے افسوس کرتے ہوئے اونٹ سے پوچھا۔ "بھئی اونٹ وہ تو ٹھیک ہے کہ تم راج محل کی چھت پر مجھے لے کر کیسے اترو گے، تم چل سکتے ہو۔ اڑ تو نہیں سکتے؟" میری بات سن کر اونٹ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کافی دیر تک ہنستا رہا۔ میں نے بھی اس سے ہنسنے کا سبب نہیں پوچھا کیونکہ میں نے ایک جگہ پڑھا تھا۔ "ہنسئے اور ڈاکٹر سے دور رہیے۔

بہر حال ہوسکتا ہے اونٹ ڈاکٹر کے پاس نہ جانا چاہ رہا ہو اور وہ ڈاکٹر سے دور رہنے کے لئے ہنس رہا ہو۔ یا پھر اس قدر تیز آواز اس کی مسکراہٹ ہو اس کا ہنسنے کا انداز نرالا تھا۔ وہ مسکرا کر بیماریوں سے دور رہنا چاہتا ہو۔ کافی دیر کے بعد اونٹ نے ہنسنا بند کیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "پیارے محسن! تم فکر مند کیوں ہوتے ہو۔ میں تمہارے لئے اڑن طشتری، اڑن کھٹولا اور اڑن گھوڑا ہی کا کام سرانجام دوں گا۔ تم مجھے ان کا قائم مقام سمجھ کر کام لے سکتے ہو۔ آؤ بیٹھو میرے اوپر اور دیکھو کہ میں صحرا کا جہاز ہی نہیں ہوائی جہاز بھی بن سکتا ہوں"۔

میں نے اونٹ کے اس دعوے کو آزمانے کے لئے اس پر بیٹھ کر دیکھا تو حیران پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ اونٹ کے دو بڑے بڑے بازو نکل آئے تھے جن پر پر نصب تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اونٹ عام اونٹ نہیں ہے۔ جھوٹا نہیں ہے جو کہتا ہے کر کے دکھاتا ہے۔ وعدہ کرتا ہے تو وعدہ نبھاتا بھی ہے۔ انسانوں کی طرح اس کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہے۔ چنانچہ مجھے بٹھا کر اس نے اڑنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے اس قدر تو اندازہ تھا کہ جس سمت سے آواز آرہی تھی اونٹ اسی سمت اڑ رہا تھا۔ میں

نے گھبرا کر اونٹ سے پوچھا۔ "بھئی! احسان مند اونٹ یہ تو بتاؤ کہ تمہیں راج محل کا پتا معلوم ہے؟"

اونٹ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "واہ مجھے راج محل کا پتا کیوں معلوم نہیں ہوگا۔ بڑے بڑے قبیلوں کے سردار، نامور ڈاکو، چور، لٹیرے، نامی گرامی بادشاہ شہنشاہ یہاں تک کہ افواج کے سپہ سالار اور بغاوت کرنے والے اور فرار ہونے والے قیدی بھی پہلے اسی راج محل سے رابطہ کر کے تیز رفتاری کے جانور حاصل کرتے ہیں۔ تب کہیں جا کر اپنے اپنے امور سر انجام دیتے ہیں"۔ اونٹ کی یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی کہ وہ بادشاہ کا راج محل تھا یا گھوڑوں کا اصطبل جو کسی بھی جنگ سے پہلے ڈاکہ ڈالنے کے لئے یا بغاوت کرنے سے قبل راج محل میں جاتے ہیں۔ تیز رفتار گھوڑا یا دوسرے جانور حاصل کرتے ہیں اور پھر کارروائی شروع کرتے ہیں"۔

میری بات سن کر ایک بار پھر اونٹ کی ہنسی آگئی۔ "حنیف میاں میں نے کہا نا کہ بڑے بڑے بادشاہ بھی پہلے وہاں راج محل میں حاضری دیتے ہیں اور پھر قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ چلو چھوڑو یہ بحث الو حنیف میاں میں راج محل کی چھت پر اتر آیا ہوں۔ اب آگے آپ کا کام ہے"۔ اونٹ نے مجھے راج محل کی چھت پر اتار دیا۔ میں نے پوری چھت کو کھنگال ڈالا لیکن کوئی شہزادی کیا ایک بھی آدم زاد نظر نہ آیا۔ میں نے راج محل کی چھت سے نیچے جھانک کر دیکھا تو چاروں طرف، اونٹ، گھوڑے ہی گھوڑے اور گائیں، بھینس اور بکریاں گھاس چرتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ میں نے غصے میں اونٹ کو آواز دی۔ "ابے اونٹ کہاں مر گیا ہے۔ ادھر تو آ۔۔۔۔" میری آواز سن کر بہت سے اونٹ چلے آئے۔ "کیا بات ہے ظالم انسان! یہ جانوروں کا راج محل ہے کوئی انسانوں کا نہیں کہ تیرا بس چل سکے گا۔ جب ہم تیرے بس میں ہوتے ہیں تو ہمارے اوپر بے شمار سامان اور وزن لاد دیتا ہے اور میلوں کا فاصلہ طے کراتا ہے۔ ذرا سا تھک جاتے ہیں تو ڈنڈے مارتا ہے۔ پورا کھانا اور پانی بھی نہیں دیتا۔ یہاں

تمیز سے بات کرو ورنہ ابھی بتاتا ہوں"۔

وہ منہ پھاڑ کر میری طرف آنے لگا تو مجھے خوف محسوس ہوا۔ میں نے اپنے اس اونٹ کو آواز دی جس پر میں سوار ہو کر آیا تھا۔ "اڑن اونٹ! تجھے راناجی کی قسم ہے۔ آ میرے پاس آ جا اور مجھے واپس لے چل"۔ میری بھرائی ہوئی آواز سن کر اسے ترس آ گیا اور وہ چند ساعتوں میں میرے قریب آ گیا۔ "اڑن اونٹ تو مجھے جانوروں کے راج محل کیوں لے آیا؟" میں نے بے بسی میں نہایت نرمی سے بات کی ورنہ دوسرے اونٹ منہ کھولے پاس ہی کھڑے تھے۔ "حنیف بابو! مجھے تو تم نے فقط اتنا ہی کہا تھا کہ راج محل لے چلو۔ میں اسی راج محل کا راستہ جانتا ہوں، اس لئے تمہیں یہاں لے آیا"۔ اونٹ نے بھولا سا منہ بنا کر کہا۔

"چلو برائے مہربانی مجھے گھر لے چلو، مجھے نیند بھی آ رہی ہے اور بھوک بھی لگ رہی ہے"۔ اونٹ نے میری التجا سن کر اشارہ کیا تو میں اس کے اوپر سوار ہو گیا۔ ابھی چند گز دور ہی گئے تھے کہ اونٹ کی نظر زمین کی طرف پڑی تو وہ خوشی سے چلانے لگا اور زور زور سے ہلانے لگا۔ "کیا ہوا اونٹ جی، یوں ہچکولے لے کیوں کھا رہے ہو، کہیں میں گر جاؤں۔ برائے مہربانی سبک رفتاری سے پرواز جاری رکھو"۔ اونٹ نے میری بات سنی ان سنی کر کے کہا۔

"حنیف میاں مجھے میری اونٹنی نظر آ گئی ہے۔ کافی دنوں بعد ملاقات ہو گی۔ تم خود ہی گھر چلے جاؤ۔ میں اپنی اونٹنی سے مل کر آتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اونٹ نے کروٹ لی اور مجھے نیچے میں پھینک دیا۔ میں نے لاکھ اس کی منت کی کہ مجھے کیچ کر لے۔ میں اتنی بلندی سے گر کر مر جاؤں گا۔ میری ہڈی پسلی بھی نہ بچے گی لیکن اونٹ تو اونٹنی کے پاس جا چکا تھا"۔ حنیف میاں نے خاموش ہو کر بچوں کی طرف دیکھا تو وہ سب حیرت سے منہ کھولے انجام جاننے کے لئے بے چین اور ششدر تھے۔ "پھر تمہارا کیا ہوا حنیف بھائی؟ تم تو زندہ ہو ہمارے سامنے، تمہیں تو کہیں خراش تک نہیں آئی"۔ ایک بچے نے بھولی سی صورت بنا کر پوچھا۔ "

کیا تھا پیو۔ میں مسہری سے کروٹ لے کر نیچے گرا اور میری آنکھ کھل گئی"۔ انجام سنا تو بچے خواب کے سحر سے باہر آئے۔

حنیف ہر روز ان کو اسی قسم کے خواب سناتا تھا اور بچے بڑے ذوق شوق سے سنتے تھے۔ کیونکہ وہ ہر بات جو دلچسپ انداز میں پیش کی جائے اس میں بچے دلچسپی لیتے ہیں اور جلد سیکھ بھی جاتے ہیں۔ حنیف کی اس عادت سے متاثر ہو کر ایک ٹیچر نے بھی یہی طریقہ تعلیم اپنایا تھا کہ وہ بچوں کو کھیل کھیل میں وہ چیز سکھا جاتا تھا جو اس کو نصاب کے مطابق پڑھانا ہوتی تھی۔ اگر والدین اور اساتذہ بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر طریقہ رائج کریں تو کند سے کند ذہن کا بچہ بھی تعلیم یافتہ ہو سکتا ہے۔ چھٹی کی گھنٹی بجی تو سب بچے خوشی خوشی اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ حنیف کو لوگ اس کے باتونی ہونے اور جھوٹی کہانیاں گڑھنے کی وجہ سے شیخ چلی کا بھائی کہنے لگے تھے۔ دراصل حنیف میں کچھ شیخ چلی والی باتیں بھی موجود تھیں۔ اس بار حنیف کی والدہ نے ناشتے میں حنیف سے کہا کہ جاؤ سامنے ہوٹل سے پائے اور روٹیاں لے کر آ جاؤ۔ حنیف پائے اور روٹیاں لینے کے لئے چل پڑا۔ ہوٹل پر پہنچ کر کہنے لگا۔

"بھئی چار روٹیاں دے دو"۔ ہوٹل والے کے پاس آٹا ختم ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "آٹا نہیں ہے اور روٹیاں نہیں پکیں تو پراٹھے ہی دے دو"۔

وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی بے وقوف انسان ہے۔ اس نے کہا۔ "یہاں بیٹھ جاؤ۔ ابھی آٹا آئے گا تو تمہیں پراٹھے پکا کر دوں گا۔ وہ دوپہر تک وہیں بیٹھا رہا۔ جب اس کے والد تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے تو گھر لے کر گئے۔ آج اتوار کا دن تھا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہوائیں ٹھنڈی چل رہی تھیں۔ چند دوستوں نے پروگرام بنایا کہ حنیف کے گھر چلیں۔ آج وہیں چل کر اس سے کہانی سنتے ہیں۔ اس لئے پانچ دوست بجے ہی شیخ چلی کے بھائی کے گھر جا بیٹھے۔

"ارے یار حنیف آج تو ہم نے سنا ہے کہ تم نے بہت ہی سسپنس والا خواب

دیکھا ہے جس میں تم نے دنیا بھر کی سیر کی ہے۔ ذرا ہمیں بھی تو سناؤ کہ تم کہاں کہاں گئے اور کیا کیا دیکھا"۔ دوستوں نے اسے موقع پر جا لیا تھا۔ خواب کا موضوع بھی انہوں نے خود ہی دے دیا تھا۔ اب تو اس شیخ چلی کے بھائی کا دماغ گردش کرنے لگا۔

"دوستو! کل رات میں نے ابن بطوطہ کی طرح دنیا کی سیر کرنے کا اور اس کی تاریخ لکھنے کا پروگرام بنایا۔ میں گھر سے نکلا ہی تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک صحرا میں پایا۔ شاید یہ سعودی عرب کا کوئی صحرا تھا۔ جس کی ریت سورج کے سامنے چٹیل کی زمین کی طرح تپ رہی تھی۔ ایک تو میں حیران اس لئے تھا کہ میں اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ چشم زدن میں سعودی عرب کے صحرا میں کیسے پہنچ گیا۔ بہر حال میرے پاؤں جلنے لگے تو میں نے رومال نکال کر پیروں کے نیچے بچھا لیا۔ مجھے پیروں میں کسی سخت چیز کی چبھن محسوس ہوئی تو میں نے اس جگہ سے ذرا سی مٹی کھود کر دیکھی۔ مجھے کسی چیز کی نوک نظر آئی۔ اب تو میرا تجسس بڑھ چلا۔ جیسے محسوس ہوا کہ شاید یہاں کوئی خزانہ دفن ہے۔ میں نے خوب ریت ہٹائی اور نیچے تک گڑھا سا بنا لیا۔ کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد مجھے ایک لکڑی کا تختہ نظر آیا۔ اس تختے کے درمیان میں وہ لکڑی گڑی تھی جس کی نوک میرے پاؤں میں چبھی تھی۔ میں نے مزید محنت کی اور ریت کو ہٹایا تو کافی جدوجہد کے بعد ایک لکڑی سے بنی ہوئی کوئی گاڑی ملی۔ میں نے تمام تر ہمت کو یکجا کر کے اسے باہر نکالا تو اس پر عربی میں لکھا تھا "صحرائی سواری"۔ مجھے اس قدر تو عربی پڑھنا آتی ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ پچھلے سال بھی میں تمام مضامین میں فیل تھا لیکن عربی کے پرچے میں پاس تھا"۔ سب بچوں نے گردن کو اثبات میں ہلا دیا اور اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"میں نے اس صحرائی سواری کو باہر نکال کر اچھی طرح صاف کیا اور اس پر سوار ہو گیا۔ اس میں مختلف بٹن لگے تھے۔ میں نے ہرے رنگ کا بٹن دبایا تو وہ تیز رفتاری سے چلنے لگی۔ مجھے بہت مزا آیا کہ میں صحرا میں ریت کی وجہ سے چل نہیں پا رہا تھا۔ کہیں پاؤں جل رہے

تھے اور کہیں پاؤں ریت کے اندر دھنس رہے تھے اور پیاس کی شدت نے الگ پریشان کیا ہوا تھا۔ میری گاڑی ایک قافلے والوں کے پاس سے گزری تو وہ سب حیرت سے مجھے اور میری گاڑی کو دیکھنے لگے۔ میں نے ان سے اشاروں میں بات کی کہ اگر انہیں میری گاڑی دیکھ کر حیران ہونا ہے تو پہلے مجھے پانی پلائیں۔ یوں میں نے گاڑی دکھا کر کسی سے پانی پیا اور کسی سے کھانا کھایا۔ حیران تو میں بھی ہو رہا تھا کیونکہ اس سے پہلے کسی نے ایسی گاڑی دیکھی نہ تھی۔ نجانے یہ گاڑی کس نے ایجاد کی تھی جو میرے نصیب میں لکھی گئی۔ شاید یہ بات سعودی عرب حکام کو کسی نے بتا دی کہ میرے پاس صحرائی سواری ہے تو سعودی حکام نے مجھے پکڑنے کے لئے پولیس کو میرے پیچھے لگا دیا۔ ان کے پاس اونٹ تھے جو صحرا کے جہاز کہلاتے ہیں وہ آہستہ آہستہ چل کر میرے پاس آتے اور میں صحرائی گاڑی کا بٹن دبا کر دور بھاگ جاتا۔ کئی گھنٹوں تک سعودی پولیس کو تگنی کا ناچ نچائے رکھا۔ پھر میری نظر صحرائی سواری کے مزید بٹنوں پر پڑی۔ ایک بٹن کے نیچے سمندر بنا تھا اور ایک بٹن کے نیچے پرندہ بنا تھا۔ ایک بٹن کے نیچے صحرا اور ایک بٹن کے نیچے پہاڑ بنا تھا ایک اور بٹن تھا جس کے نیچے درخت بنے تھے۔ میں ان بٹنوں کا مطلب سمجھ نہ سکا تھا لیکن کچھ کچھ بات سمجھ میں بھی آ رہی تھی کہ جس بٹن کے نیچے پانی بنا تھا یعنی سمندر تھا شاید یہ گاڑی اس بٹن کو دبانے سے سمندر میں بحری جہاز کی طرح چلنے لگے۔ جس بٹن کے نیچے درخت بنے تھے ہو سکتا ہے کہ اس بٹن کو دبانے سے جنگلات میں گاڑی دوڑنے لگے۔ جس بٹن کے نیچے پرندہ بنا ہے ہو سکتا ہے کہ اس بٹن کو دبانے سے صحرائی سواری ہوائی جہاز بن کر اڑنے لگے۔ اف اللہ اگر ایسا ہو گیا تو کتنا مزا آئے گا"۔

"انتہائی دلچسپ کہانی تھی"۔ پانچوں بچے نہایت انہماک سے سن رہے تھے۔
"شیخ چلی کے بھائی آگے تو بتاؤ کہ کیا ہوا؟" پپو نے عجلت اور بے دھیانی میں اسے اس خطاب سے پکارا جس سے لوگ پکارتے تھے۔ "خبردار پپو اگر تم نے مجھے آئندہ شیخ چلی کا بھائی کہا تو میں تمہیں اپنی صحرائی سواری میں نہیں بٹھاؤں گا"۔ حنیف نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے

اسے ڈانٹ دیا اور تڑی بھی لگائی۔ باقی دوستوں نے مسکرا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔''

ہاں تو دوستو! میں نے دیکھا کہ سعودی پولیس نے ہیلی کاپٹروں کو بلا لیا ہے جو میرے سر کے اوپر آ کر پرواز کرنے لگے اور مجھے بندوق دکھا کر اشارہ کرنے لگے کہ میں اس گاڑی سے اتر جاؤں۔ میں بھلا اتنی خوبیوں والی گاڑی کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ میرے انکار پر ایک پولیس اہلکار نے ٹرائیگر دبایا تو میں نے بھی وہ بٹن دبا دیا جس پر پرندہ بنا تھا۔ ارے یار بلو بٹن دبانا تھا کہ میری گاڑی صحرا کی ریت کو چھوڑ کر ہوا میں اڑنے لگی۔ پھر کیا تھا ہیلی کاپٹر میرے پیچھے پیچھے تھے اور میں آگے آگے۔ کئی گھنٹے تک انہیں الو بناتا رہا۔ تب مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پولیس نے مزید مزائلوں سے بھرے ہوائی جہازوں اور جنگی طیاروں کو طلب کر لیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجھے چاروں طرف سے جنگی اسلحہ بردار جہازوں نے گھیرے میں لے لیا اور مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کرنے لگے۔ میں گھبرا گیا تھا کیونکہ بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اچانک میری نظر نیچے کی جانب پڑی تو مجھے حوصلہ ہوا کہ میں ان کے ہوائی جہازوں اور طیاروں سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا سمندری حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ میرے پاس آخری چارہ یہی تھا کہ اپنی صحرائی سواری کو سمندر میں اتار دیتا۔ میں نے اپنی گاڑی کی یہ خوبی بھی آزما کر دیکھنا چاہی اور فوراً وہ بٹن دبا دیا جس پر سمندر بنا تھا۔ میری گاڑی چیل کی طرح زمین کی طرف رخ کر کے غوطہ کھا کر دیکھتے ہی دیکھتے بحری جہاز کی طرح پانی میں چلنے لگی۔ اب میں ان کی پہنچ سے دور ہوا تو ان کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے اوپر ہی سے فائر برسانا شروع کر دیئے۔ میں نے اپنی گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی لیکن ہیلی کاپٹر اور جنگی جہاز میرے سر پر ہی تھے۔ سو میں نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اپنی گاڑی کا رخ نیچے کی طرف کر دیا۔ سمندر کے اندر جا کر گاڑی میں لگا خطرے کا الارم بجنے لگا میں نے فوراً اس الارم کا ہرے رنگ کا بٹن دبا دیا۔ بٹن دباتے ہی میری گاڑی نے جھٹکا کھایا اور آن واحد میں وہ آب دوز بن گئی۔ اب مجھے کسی سے خطرہ نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کو سمندر کی تہہ میں اتارا اور سکون کا سانس لینے لگا۔ شاید یہ کوئی وہیل مچھلی تھی۔ بہت

بڑی تھی میں نے ایک فلم میں اس کی طاقت کا اندازہ لگایا تھا۔ اس وہیل مچھلی نے ٹکر مار کر بحری جہاز کو الٹا دیا تھا۔ مجھے اس سے بہت خوف آیا۔ میں ڈرنے لگا لیکن مجھے دلاسہ اس وقت ملا جب وہ میری گاڑی کو دیکھتی ہوئی پاس سے گزر گئی۔ ابھی وہیل مچھلی کا خطرہ ٹلا تھا کہ سامنے سے مگرمچھ منہ کھولے میری ہی طرف آ رہا تھا۔ یہ بڑا وحشی جانور تھا۔ انسان کا دشمن۔ انسان کو جبڑے میں جکڑنے کے بعد چھوڑتا ہی نہیں تھا۔ وہ میرے پاس آیا تو میں نے اسے سلام کیا۔ وہ بھی مسکراتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ میں وہیل مچھلی اور مگرمچھ سے تو بچ گیا تھا لیکن سمندری گھوڑا انجانے کیا سوچ کر میری طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کے لئے اشارہ بھی کیا کہ دوست! تیری میری کوئی دشمنی نہیں ہے نہ کبھی میں نے تیری بھینس کھولی ہے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اسے سمجھایا تو شاید اس کی سمجھ میں آ گیا۔ خدا تعالیٰ نے جانوروں کے حملے سے بچانا ہی تھا کہ مجھے دور سے دو آب دوزیں آتی دکھائی دیں۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس نے مجھے سمندر میں اترتے دیکھ لیا تھا۔ یقیناً یہ میرے ہی تعاقب میں آئی ہیں۔ میں نے اپنی گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور سمندر کی اوپری سطح پر لے آیا۔ میرے پیچھے پیچھے پولیس کی گاڑی بھی آ رہی تھی۔ سمندر کے کنارے پر بھی پولیس موجود تھی اور صحرا میں بھی پولیس گشت کر رہی تھی۔ ایک ہی راستہ بچا تھا۔ میں نے وہ بٹن بھی دبا دیا۔ جس پر درخت بنا تھا۔ اب تو میری گاڑی جنگلات میں دوڑنے لگی۔ میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ سمندر کے اس پار جنگلات کا سلسلہ تھا سو میں نے تیز رفتاری سے سمندر عبور کیا اور گاڑی کو جنگلات میں لے آیا۔ کیسی عجیب وغریب اور بے پناہ خوبیوں والی گاڑی تھی۔ خود بخود درختوں سے بچتی بچاتی دوڑے جا رہی تھی۔ یہاں تک آنا پولیس کے بس کی بات نہیں تھی۔ سو میں نے کچھ دیر آرام کرنے کی نیت سے گاڑی کو روک کر بند کر دیا اور سستانے لگا۔ اتنے گھنٹوں سفر کرتے رہنے سے مجھے چکر سے بھی آ رہے تھے اور بھوک کی وجہ سے نڈھال بھی ہو گیا تھا۔ چند گھنٹوں کے لئے میری آنکھ لگ گئی۔

کسی کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے چاروں طرف جانوروں کو پایا۔ میں نے تو اب کلمہ طیب پڑھ لیا تھا کیونکہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں پولیس اور سمندر جانوروں سے تو بچ گیا ہوں لیکن ان درندوں سے بچنا مشکل ہے۔ اس لئے موت کا وقت آ گیا ہے۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ ایک بندر نے مسکراتے ہوئے مجھ سے اشارے میں پوچھا۔ "کیا چاہیے؟" میں نے اس بندر کا اشارہ سمجھتے ہوئے پانی پینے کا اشارہ کیا۔ میری حیرت میں اس بندر نے اور اضافہ کر دیا کہ فوراً دو ناریل پیش کیے۔ جن کا پانی پینے سے نہ صرف میری پیاس بجھ گئی بلکہ نئے سرے سے توانائی بحال ہو گئی۔ پانی پی کر پھر میں نے بندر کی طرف دیکھا تو اس نے اشارہ کیا۔ "کیا چاہیے؟" میں نے کھانا کھانے کا بتایا۔ بندر نے فوراً سیب، کیلے اور آم پیش کر دیئے۔ نجانے وہ مجھ پر احسان کیوں کیے جا رہا تھا۔ میں نے کیلے، آم اور سیب کھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے مطمئن دیکھ کر وہ سب خوشی کا اظہار کرنے لگے اور میرے گرد حصار باندھ کر رقص کرنے لگے۔ میں نے ایسا سین کسی فلم میں دیکھا تھا کہ آدم خور انسان کو پا کر ایسا ہی رقص کرتے تھے اور پھر اسے کچا چبا جاتے تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا۔ اس سے پہلے وہ بھی میرا گوشت چبانا شروع کرتے میں نے گاڑی چلائی اور وہ بٹن دبا دیا جس پر پرندہ بنا تھا۔ ایک لمحے میں گاڑی ہوا میں اڑنے لگی اور آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ مجھے گاڑی کی ایک جھری میں ایک کاغذ کا ٹکڑا نظر آیا۔ میں نے وہ کاغذ کا ٹکڑا کھول کر دیکھا تو اس پر دنیا کا نقشہ بنا تھا۔ میں معاشرتی علوم میں بھی کافی تیز ہوں۔ کیوں لطیف بھائی تجھے تو پتا ہی ہے"۔ حنیف نے لطیف کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں حنیف بھائی تم معاشرتی علوم اور جغرافیہ جاننے میں اتنے ماہر اور تیز اور ذہین ہو کہ دو ہفتے پہلے اپنے ہی گھر کا راستہ بھول گئے تھے"۔ حنیف کو کہانی سنانے کی دھن سوار تھی۔ اس نے توجہ نہیں دی کہ لطیف کیا طنز کر گیا ہے۔

"ہاں تو دوستو! اس کاغذ پر دنیا کا نقشہ بنا تھا۔ میں نے نقشہ سمجھ کر سمت کا تعین کیا

اور گاڑی کو دو چار غوطے لگا کر پاکستان کی حدود میں اتار لیا۔ جیسے ہی میری گاڑی زمین پر اتری، مجھے پاکستانی پولیس نے پکڑ لیا اور خوب مارا کہنے لگے کہ تم ابن بطوطہ کی گاڑی چوری کر کے چلاتے ہو۔ اس کا لائسنس کہاں ہے"۔ میں نے وہ رشوت کے طور پر انہیں دے کر جان چھڑائی۔ ابھی گھر بھی نہ پہنچ پایا تھا کہ راستے میں ابن بطوطہ کی روح مل گئی۔ اس نے مجھے گاڑی واپس کرنے کا کہا۔ مگر میں گاڑی کیسے واپس کرتا۔ میرے انکار پر ابن بطوطہ کی روح مجھے ایک قبرستان میں لے گئی۔ جہاں قبریں ہی قبریں تھیں۔ اس نے میرا گلہ دبا کر ایک قبر میں دفن کر دیا تھا۔ جیسے ہی مٹی کو میرے اوپر ڈالا میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے چیخ مار کر مٹی کو اپنے اوپر سے ہٹایا تو میری آنکھ کھل گئی۔ امی نے ایک چپت زور سے مارا کہ میں نے خواہ مخواہ اپنے اوپر سے کمبل کو اتار پھینکا جو سالن میں آ گرا۔ اس جرم کی پاداش میں مجھے صبح کا ناشتہ بھی نہیں ملا"۔

"کہانی یا خواب بہت دلچسپ تھا"۔ پپو نے تعریف کی۔ "شیخ چلی کے بھائی اب تم بدروح بن چکے ہو۔ ابن بطوطہ نے تمہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہے اور قبر میں دفن بھی کر دیا۔ اس لئے تم اب کے خواب بدروحوں کے دیکھنا۔ تا کہ کل ہم تمہارا خواب سنیں تو خوف محسوس کریں"۔ بچوں نے یہ کہہ کر الوداعی نگاہ شیخ چلی کے بھائی پر ڈالی اور روانہ ہو گئے۔ وہ پہلے سے موضوع اس کے ذہن میں بٹھا دیتے تھے کہ وہ اچھے سے اچھا خواب بن سکے یا بہترین کہانی گڑھ سکے۔

کل صبح تو وہ حنیف سے کہانی سن کر آئے تھے۔ عجیب خبر تھی کہ آج وہ ہسپتال میں داخل تھا۔ اس کے دوستوں نے پروگرام بنایا کہ ہسپتال میں اس کی خیریت دریافت کرنے چلا جائے۔ چنانچہ کافی سارے دوست اکٹھے ہو کر حنیف سے ملنے ہسپتال چلے گئے۔ "یار پپو! اپنی زبان بند رکھنا تم اس کو شیخ چلی کا بھائی کہہ دیتے ہو۔ جس سے وہ طیش میں آ جاتا ہے۔ چلو جب ٹھیک ٹھاک تھا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اب تو وہ بیمار ہے اور اس کی ٹانگ

ڈٹ چکی ہے وہ صدمے سے چور ہو گا۔ برائے مہربانی اسے شیخ چلی کا بھائی مت کہنا"۔
طیف نے پپو کو سمجھایا اور گڈو کو نصیحت کی۔ "پیارے دوست آج اس سے کہانی سننے کی فرمائش
ست کرو بیٹا اور نہ کوئی یہ نہ پوچھے کل رات اس نے کیا خواب دیکھا ہے۔ کیونکہ وہ خواب دیکھے
نہ دیکھے، سنانے بیٹھ جاتا ہے۔ اس لئے ہم اس کی مزاج پرسی کے لئے جا رہے ہیں۔ کوئی
خواب سننے کے لئے نہیں اور ہاں آئندہ کے لئے حنیف کو کوئی موضوع دے کر بھی نہ آنا ورنہ وہ
س موضوع کے گرد اپنا خواب بنتا رہے گا اور کوئی نہ کوئی کہانی گھڑ لے گا۔" لیکن بلوتم نے جو
ہے اتوار کے دن بدروحوں کا موضوع دیا تھا۔ اس نے اس پر کہانی بنائی ہو گی تو وہ ضرور
ائے گا۔ بغیر سنائے اس کا کھانا ہضم نہیں ہو گا"۔ پپو نے بھی ایک سوال کر ڈالا۔ "ہم پوری
پوری کوشش کریں گے کہ خیالات کی دنیا، سوچ و فکر کی وادی، تصورات کی جنت اور احمقوں کی
ستی سے اسے باہر نکال لائیں اور تصورات کی بجائے حقیقت کی دنیا کی سیر کرائیں تاکہ وہ
ھی انسانوں کی طرح رہے لوگ اس کا مذاق نہ اڑائیں"۔
سب نے عہد کیا کہ اسے سنجیدگی سے بتانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔
سپتال آ چکا تھا۔ وہ سب ہسپتال میں داخل ہو کر اس کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ مشکل
س سے کا کمرہ ملا۔ لیکن کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ سب نے اپنے اپنے طور پر ڈھونڈا
یکن کسی کو حنیف تو کیا اس کی خبر بھی نہیں ملی۔ نرسوں، ڈاکٹروں اور وارڈ بوائز سے معلومات کی
لہ ان کا دوست کہاں ہے۔ کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ سب مایوس ہو کر آنے لگے تو ان کی نظر اس
یم پر پڑی جس میں حنیف کی تصویر لگی ہوئی تھ۔ لیکن اب اس فریم میں تصویر نہیں تھی بلکہ
یک کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ "بدروحیں نظر نہیں آتیں"۔ سب نے ایک
وردار قہقہہ لگایا اور اس کاغذ کے نیچے شیخ چلی کا بچہ لکھ کر واپس لوٹ آئے۔

☆☆☆